ڈیڈ سی
(افسانوی مجموعہ)
شہاب دائروی

ڈیڈسی

شہاب اثروی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

DEAD SEA

(Short Stories)

by

Shahab Dairvi

Year of Ist Edition 2009
ISBN 978-81-8223-589-2
Price Rs. 125/-

نام کتاب	:	ڈیڈسی (افسانوی مجموعہ)
مصنف وناشر	:	شہاب دائروی
پتہ	:	Daira, Bihar sharif, Nalanda, 803101
ترتیب	:	ڈاکٹر عشرت آرا سلطانہ (ریڈر، پی ایچ ڈی۔ڈی لٹ)
سنِ اشاعت	:	۲۰۰۹ء
کتابت	:	سیّد محمد جلیل
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	۱۲۵ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi- 6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

انتساب

جناب محترم بزرگ

ایس ایم شاکر، جمشید پور

اور

جناب حاجی سیّد شاہد شرف الدین

کے نام

□□□
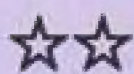
اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون شامل ہے۔
اس کتاب میں شائع مواد سے بہار اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
کسی بھی قابل اعتراض مواد کی اشاعت کے لیے مصنف خود ذمہ دار ہوگا۔

ملنے کے پتے :

۱- بُک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴
۲- ایس ایم فرزین شہاب، دائرہ، بہار شریف (نالندہ)
۳- تاج بک ڈپو، امین روڈ، رانچی (جھارکھنڈ)

○○○

فہرست

□□□

کچھ مجموعہ "ڈیڈ سی" کے بارے میں

شہاب دائروی گذشتہ چار دہائیوں سے کہانیاں لکھ رہے ہیں، ان کے دو افسانوی مجموعے "میں کیا کروں" اور "پلاسٹک کا انسان" شائع ہو چکے ہیں، لیکن اردو کے نقادوں کی نگاہ ان پر نہیں پڑتی اور نہ تو اس ضمن میں دائروی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا رابطہ اس طرح ان سے قائم ہو کہ وہ لازماً ان کی طرف توجہ کر سکیں۔ بہر حال گوشہ گیری انھیں بھا گئی ہے اور یہ اچھا بھی ہے۔

اس وقت میرے سامنے شہاب دائروی کے متعدد افسانے ہیں۔ مثلاً —— ڈیڈ سی، احساس جرم، حادثہ، لالچی، ٹوٹے سپنے، پرکھ، چہرے، امن کا پہلا پڑاؤ، ثبوت کوئی ثبوت، انسانیت، آوارہ خط کا سفر، سچا رشتہ، خاموش نگاہیں، سراب، ایثار، کہاں ڈھونڈا کہاں پایا —— ان کے مطالعے سے بعض باتیں از خود واضح ہو جاتی ہیں اور وہ یہ کہ موصوف غایت اختصار سے کام لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایسی جامعیت ہوتی ہے کہ کوئی جملہ جزو افسانہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فنی طور پر وہ اس نکتے سے آگاہ ہیں کہ افسانے کی پہلی شق اس کا اختصار اور اس کی جامعیت ہے۔ لہٰذا ان کے یہاں افسانوں میں تین مربوط ارتقائی مرحلے سامنے ہوتے ہیں۔ ابتدا، ارتقا اور انتہا، اور ان تینوں مرحلوں میں وہ جزئیات پر زیادہ نگاہ نہیں رکھتے بلکہ وہی پہلو پیش نظر رکھتے

ہیں جو اختتام تک تاثر میں شدت اختیار کرلے۔ آج افسانہ جس موڑ پر کھڑا ہے وہ کتنے ہی نئی جہتوں سے ٹکرا رہا ہے۔ منطقی ربط اب کوئی ایسا استدلال نہیں کہ جس کی بنیاد پر کسی افسانے کو معیاری یا کسی افسانہ نگار کو اہم بنانے کا نسخۂ کیمیا ہو، یہ عوامل قدریں پرانے ہیں، لیکن دائردی اپنے دائرے سے ہٹنا نہیں چاہتے اور جو ڈگر انھوں نے ۳۰، ۳۵ سال قبل قائم کررکھی تھی اس پر آج بھی کاربند ہیں۔ اس لئے نئے تجربے کی کوئی آنچ تلاش کرنے پر بھی نہیں ملے گی اور یہ کوئی ضروری امر بھی نہیں ہے کہ ہر شخص تجربے کے عمل سے گذرے اور فنی برتاؤ میں نئے ابعاد پیدا کرے۔

شہاب دائردی کے موضوعات ان کے ارد گرد بکھری زندگی کے شاخسانے ہیں، جنھیں وہ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے رہے ہیں۔ گویا موصوف سماج کی ناہمواریوں کے افسانہ نگار ہیں، انہیں اس بات کا احساس ہے کہ ان کے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب ٹھیک نہیں ہے تو پھر فن کار کیا کرے، اسے تو تجربہ کرنا ہے یا مشاہدے سے گذرنا ہے، اس لیے کہ مسائل کا حل اس کے پاس نہیں ہے، ہو بھی نہیں سکتا، لیکن فن کار ایسی اونچ نیچ پر نظر رکھے تو اس کا فن قابل مطالعہ بن سکتا ہے۔ فنکار دیکھی اور محسوس کی گئی زندگی کو آئینہ بناتا ہے اس مرحلے میں اس کی اپنی دیدہ وری کام آتی ہے۔ دائردی اپنی بساط بھر کوشش کرتے ہیں کہ ان کے افسانے میں زندگی چہکتی رہے لیکن جہاں انفعال کی صورت ہو وہ بھی نمایاں ہو۔ کہہ سکتے ہیں کہ موصوف فنی طور پر نہ تو انفعال کے شکار ہیں اور نہ ہی اثباتیت انھیں بہت دور لے جاتی ہے۔ آئینے کا کام حقیقی چہرہ دکھانا ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

ذیل میں ان کے ایک افسانہ "ڈیڈسی" کا حوالہ دیتا ہوں۔ اس میں کئی چیزیں بے حد اختصار کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں، مثلاً: نوجوان التمش کا ایک کنواری لڑکی خالدہ کی نگرانی میں کام کرنا، دونوں کا عشق، شادی، اس کے بعد بچوں کی پیدائش، خالدہ کے جسم کی دلکشی کا ختم ہونا اور التمش کی لاتعلقی، پھر ایک نوجوان ملازمہ سے التمش کا جنسی

طور پر ارتباط اور خالدہ کا معمولی سا ردِعمل ۔ یہ ہے کہانی کا قوام ۔ جوانی میں ایسی کہانیاں چھُپ چھُپ کر پڑھی جاتی رہی ہوں گی ، لیکن اب اِنٹرنیٹ کے زمانے میں ایسے موضوعات نوجوانوں کو بھی مشتعل نہیں کرسکتے ۔ لیکن کیا کیا جائے کہ کچھ ازلی جبلتیں ہیں جن کے زیرِ اثر اس طرح کے واقعات سرزد ہوتے رہیں گے ۔

میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہلکی پھلکی رومانی کہانیاں آج بھی لکھی جارہی ہیں جس کا اندازہ "ڈیڈسی" جیسے افسانوں سے ہوتا ہے ۔ اگر آپ شہاب دائردی کے افسانوں میں فکر و نظر کی عمیق دنیا تلاش کریں گے تو آپ کو مایوسی ہوگی اس لیے کہ دائروی ایسے عمل سے نہیں گذرتے اور ان کے یہاں بیان اپنی سطح پر رہتا ہے ۔ متنی اور معنوی دونوں اعتبار سے ۔ لہٰذا دائردی کے فن کو ایسی ہی سطح پر رکھ کر دیکھنا چاہیئے ۔ رموزِ والامَم کی دنیا دوسروں کے لیے ہیں ، موصوف کو تو جبلت کا پاس ہے ، جو ہر حال میں متحرک رہتی ہے اور شاید بدلتی نہیں ۔

میں نہیں چاہتا کہ موصوف کے دوسرے افسانوں کا تجزیہ پیش کروں لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ شہاب دائردی اب بھی افسانے تفریحِ طبع کے لیے تخلیق کرتے ہیں ۔ فکر و فلسفہ کی راہیں نئے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی تلاش کی جاسکتی ہیں لیکن دائردی ایسی فکری الجھنوں سے دوچار ہونا نہیں چاہتے اور زندگی کی بالائی اُمنگوں کو گرفت لینے میں عافیت محسوس کرتے ہیں ۔ ہلکے پھلکے انداز میں زندگی کی وہ رمق جو سطح پر تیرتی ہے ، اسے چھاننے کے عمل سے تھکتے نہیں ۔ یہی ان کی خصوصیت ہے ، نئی پیچیدگی اور ابہام سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ۔ ان کی پلاٹ سازی میں جہاں بالائی سطح ہی محیط ہوتی ہے ، اسے تشکیل کرنے میں سامنے کی زبان استعمال کرتے ہیں ۔ استعارات اور تشبیہات سے الگ تھلگ وہ اپنے احساسات ، کو روزمرّہ کی زبان عطا کرتے ہیں ۔

افسانہ اور اردو افسانہ کئی مرحلوں سے گذر کر وہاں پہنچ گیا ہے جہاں فکری لہریا بہت تیز ہوگئی ہیں جنھیں گرفت میں لینے کے عمل میں ذہن کے کتنے ہی دروازے

واکرنے پڑتے ہیں ایسے میں شہاب دائروی کے افسانے ذہن ودماغ کو ریلیف پہنچانے کا کام سرانجام دیتے ہیں، یہی بہت ہے۔

مجھے امید ہے کہ شہاب دائروی کا یہ نیا مجموعہ یعنی "ڈیڈسی" ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔

وہاب اشرفی

۹ر مارچ ۲۰۰۷ء

کہانی سے پہلے

فن انسانی مشاہدات وتجربات کا عکس جمیل ہوتا ہے۔
یہ افسانوی مجموعہ "ڈیڈسی" میرے مشاہدات وتجربات کا تیسرا مجموعہ ہے۔
میں ۱۹۵۷ء سے لگاتار لکھ رہا ہوں۔ عصری حالات وکیفیات کے زیر اثر میں نے اپنی کہانیوں کو جنم دیا ہے۔ میری کہانیاں ہند وپاک کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اور میری کتابیں "میں کیا کروں ؟" اور "پلاسٹک کا انسان" شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جو اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔
قارئین اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ آج تنقید کی دنیا محض تعلقات کی بنیاد پر قائم ہے۔
آج تنقید حقیقت سے بہت دور نظر آتی ہے۔ ادبی وفنی معیار ومیزان پر تنقید نہیں کی جاتی ہے۔
آج کے بیشتر ناقد کسی فن پارہ کی جانچ و پرکھ ایمانداری کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ تعلقات اور دوسروں کے خیال ونظر کو ہی روا رکھتے ہیں۔ حالانکہ سچی اور معیاری تنقید وہی ہے جو حسن و قبح اور حقیقت کی کسوٹی پر کھری اترتی ہو۔
آج حقیقت پسند ادیب وفن کار کی کوئی قدر ومنزلت نہیں، آج ادیب وفن کار کی شخصیت کو صرف قارئین ہی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ طرف داری اور پاس داری سے دور

ہوتے ہیں۔

آج تنقید کی دنیا کافی بسیط وعریض بساط پر آباد ہے۔ لیکن تنقید نگاری کا طریقہ محدود و محصور ہے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ حقیقت و ایمانداری اور سالم رائے کو بروئے کار لایا جائے اور ادیب و فن کار کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے۔ تاکہ ایک حقیقت پسند اور سچے فن کار کی ادبی شخصیت روشن و منور ہو سکے۔

مَیں اپنی کہانیوں کے بارے میں کیا کہوں؟ میں تو قارئین کی آرا کو ہی سب کچھ سمجھتا ہوں۔ ان کی آرا کا متمنی ہوں۔ اس سلسلے میں مَیں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ہر نوعیت کی کہانی کو بروئے کار لایا ہے۔ خواہ وہ انفرادی یا اجتماعی یا نفسیاتی نوعیت کی ہو۔

شہاب دائروی

ڈیڈسی

اپنی ملازمت کے پہلے دن نائب پرسنل آفسر کا چارج لینے کے بعد التمش جب رسمی ملاقات کی خاطر چیف پرسنل افسر خالدہ کے چیمبر میں داخل ہوا تو انھوں نے دفتری آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ کو جنبش دے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا، بڑی متانت سے کال بل بجا کر چپراسی کے حاضر ہوتے ہی چائے لانے کا حکم دیا۔ اور پھر وہ اپنی گردن جھکا کر اس فائل کی طرف رجوع ہو گئیں جو اُن کے سامنے کُھلی تھی ــ التمش خاموش بیٹھا کن انکھیوں سے ان کے جسم کے ہر پہلو سے اُبھرتے ہوئے شرارے کی حدت اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا ــ، یہ مرد کی فطرت کا تماشہ ہی ہے کہ پل بھر میں اس کا دماغ اس کے ہرجائی پن سے مغلوب ہو جاتا ہے ـــ۔ اسی دوران چپراسی ٹرے میں چائے لے آیا۔ دونوں اپنے مشاغل کو چھوڑ کر ٹیبل کے دو طرف آمنے سامنے بیٹھے چائے کی چُسکیاں لینے لگے، خالدہ پہلی چسکی لینے کے بعد اپنے جاذب نظر چہرے سے تاثر کا رنگ چھوڑے بغیر بولیں ــ

"آپ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اپنی عمر کا کچھ ہی حصہ گذار کر اپنی صلاحیت کے سہارے ابھی سروس پالی ہے، میری طرف سے آپ اطمینان رکھیں ــ، پورا تعاون ملے گا ــ شرط صرف یہ ہے کہ کسی بھی ملازم کی عرضی پر خواہ وہ یونین کا بارسوخ نمائندہ ہی کیوں نہ

نہ ہو آپ کا ریمارک ان قوانین کے تحت ہو جو کمپنی میں نافذ ہیں اور اس بات کا بھی دھیان رہے کہ ملازم کی حق تلفی نہ ہو اور نہ کمپنی کا خسارہ ۔ نائب پرسنل افسر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کلرکوں کی نوٹنگ پر آنکھیں بند کر کے دستخط نہ کیا کرے بلکہ وہ خود ملازم کی عرضی کی تمام قانونی باریکیوں پر پوری سنجیدگی سے سوچ کر اپنی رائے دے تاکہ اس کی روشنی میں جو حکم صادر کیا جائے وہ قانونی اعتبار سے غلط ثابت نہ ہونے پائے اور نہ ہی برانچ کی بدنامی ہو۔"

"آپ کا تعاون جب تک مجھے حاصل رہے گا میری تحریر شدہ چھوٹی بڑی غلطیاں آپ کے قلم سے دور ہوتی رہیں گی ۔ رفتہ رفتہ جب میں دفتری پیچیدگیوں سے پوری طرح واقف ہو جاؤں گا تو میری خاطر آپ کو زیادہ دیدہ ریزی نہ کرنی پڑے گی ۔" التمش نے کہا۔

"بے فکر ہو کر کام کریں ۔ میں ہوں نا ۔" خالدہ کے لبوں پر اپنی فضیلت کی دبی دبی ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی ۔

التمش اپنائیت کی مٹھاس بھری بات سن کر اپنے چیمبر میں آ گیا ، خالدہ کی باتوں سے اس کے حوصلے کو بڑی تقویت ملی تھی ۔ یہاں جوائن کرنے سے پہلے وہ کئی فرموں کے پرسنل ڈیپارٹمنٹ میں کام کر چکا تھا ۔ اس وجہ سے جو عرضیاں اس کے ریمارک کے لیے پیش کی گئی تھیں اس کو نپٹانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی ۔ لنچ کے وقت کے آغاز کا جب سائرن بجا تو اس نے چپراسی سے کافی منگوائی اور کافی کے ہر گھونٹ اس کے ذہن کی اڑان کے حصار میں خالدہ کا وجود مقید ہوتا گیا ۔ جوانی کی سرحد پر ابھی اس نے قدم رکھا تھا ۔ خون میں جوش تھا ، بازوؤں میں طاقت تھی اور وہ اپنی زندگی میں بہاریں لانے کا آرزو مند تھا۔ اس کے دماغ سے ایک لہر پھوٹ کر اس کے جاذب نظر جسم کا ہر عضو اُبھر آیا ، پلکوں کی گھنی چھاؤں پرکشش تھیں ۔ رخسار کی بناوٹ میں قدرت کی فیاضی کا دخل تھا ، اس خیال کے دباؤ سے وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ خالدہ کو پالے تو اس کا مستقبل ۔ شہرت ، دولت اور عیش و عشرت کے گہواروں میں جھولتا رہے گا ۔ نوجوانی کے آغاز کے دنوں میں آزاد پسند نوجوانوں کے جذبات میں چنگاریاں بھر کر ان کے دلوں سے انجام کا خوف نکال دیتی ہیں ۔

اَلتمش کے دماغ میں بھی اسی طرح کے کیڑے بڑی تیزی سے رینگ رہے تھے ۔ اس نے خالدہ اور اپنی عمر کے درمیانی فرق کو بھلا دیا جو بڑا واضح تھا ، اور اپنے جنونی جذبات کے تحت اپنی آئندہ زندگی کے آئینہ میں خالدہ کا عکس دیکھنے کا خواہاں ہوگیا ۔ چند دنوں تک بہ ظاہر اس کے معمول میں کوئی فرق ابھر کر سامنے نہیں آیا ۔ وہ جب بھی کوئی اہم رائے لینے خالدہ کے چیمبر میں گیا تو دفتری آداب کا لحاظ کرتا رہا اور خالدہ اپنے منصب کی برتری کے مقام سے نیچے نہیں سرکی ۔ چند دنوں کی ملاقاتوں سے دلوں میں اُنسیت قدرتی طور پر پیدا ہوئی ہوگی ، لیکن اظہارِ تکلم میں بے تکلفی کا جذبہ کسی دن چھلکا نہیں تھا ۔ التمش بے چین تھا کہ دفتری آداب کی دیوار کس طرح ڈھائی جائے ۔؟ خالدہ کے اندازِ تخاطب سے وہ اس کے مزاج کا صحیح اندازہ لگا نہیں پایا تھا ۔ پہل کرنے میں یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں اس کا طرزِ تکلم اس کے درمیان نہ بھری جانے والی کھائی پیدا کر دے اور اس کی خواہشات اس کے دل میں فنا نہ ہو جائیں ۔ کئی دن اور تذبذب، انتشار اور ذہنی الجھنوں میں گذر گئے ۔ پھر اچانک ایک دن تغیراتِ زمانہ کی طرح اس نے خالدہ میں بدلاؤ دیکھا ۔ اس کے دل کی چاہت کی خوش کُن ہوا لگی ۔ خالدہ نے اس پر اپنی چمکتی ہوئی نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا ۔

" فرصت کے اوقات میں چلے آیا کرو ، کبھی کبھی کام نہ رہنے کی وجہ سے میں کُرسی پر اکیلی بیٹھی اکتا جاتی ہوں ۔"

" مَیں خود سے ایسی جسارت کیسے کرتا ؟ ۔ آپ میری اِنچارج ہیں ، بغیر کوئی کام کے آنا اصولاً غلط ہوتا ۔" التمش کی نگاہیں خالدہ کی گردن کے نیچے کے اس حصّہ کو چاٹ رہی تھیں جو بلاؤز کے ایک بٹن کے کھلا رہ جانے کی وجہ سے عیاں تھا ، اور جس سے جنسی کشش اُبھر رہی تھی ۔

" ہم دونوں جب اکیلے ہوں تو تمھیں دفتری آداب و لحاظ کا خیال رکھنے کی کوئی بھی ضرورت نہیں ، تم بھی اکیلے ہو ۔ مَیں بھی اکیلی ہوں ۔ اور اس اکیلے پن کے کانٹے کی طرح چبھتے ہوئے احساس کو کیوں نہ ہم شیریں باتوں کا رس پی کر بھلانے کا جتن کریں ۔ اگر تمھارا کوئی

پروگرام نہ ہو تو شام کا ناشتہ میرے بنگلہ پر کرنا ــــ" خالدہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی ــــ
"مَیں اب تک یہاں اپنے مزاج کا کوئی آدمی تلاش نہیں کر پایا ہوں ــــ" التمش نے کہا ــــ اسی وقت چیمبر میں داخل ہو کر چپراسی نے خالدہ سے کہا ــــ
"بڑے صاحب نے یاد کیا ہے میڈم ــــ"
"مَیں تمھارا انتظار کروں گی ــــ؟" خالدہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر چیمبر سے نکل گئیں۔
التمش کی مُراد پوری ہونے کی راہ خود بہ خود نکل آئی تھی ــــ وہ من ہی من میں خوش ہوتا ہوا اپنے چیمبر میں لوٹ آیا ــــ
دن کی روشنی مدھم ہونے سے پہلے خالدہ کی سرکاری رہائش گاہ پر پہنچ گیا ــــ بنگلہ کے میدان کے وسط ایک کرسی پر خالدہ شیفون کی ساری میں ملبوس بیٹھی کوئی جریدہ پڑھ رہی تھیں ــــ التمش کے قدموں کی آہٹ پا کر اپنی نگاہیں اٹھاتی ہوئی بڑی خندہ پیشانی سے بولیں ــــ
"میں تمھاری راہ تک رہی تھی ــــ بشارت میاں، صاحب آگئے ہیں، ناشتہ لے آؤ ــــ"
بشارت میاں جو برآمدے میں حکم پانے کا مُنتظر کھڑا تھا، فوراً اس نے ٹرے میں ناشتہ لاکر قرینے سے ٹیبل پر سجادیا، اس وقت التمش کی نگاہیں خالدہ کے گھٹیلے صندلی بازوؤں پر پھسل رہی تھیں ــــ!
"یہ میرا بنگلہ ہے، آفس نہیں ــــ نہ مَیں یہاں چیف پرسنل افسر ہوں اور نہ تم میرے اسسٹنٹ، یہاں ہم دونوں خالدہ اور التمش ہیں جو اپنے اپنے اکیلے پن سے بیزار ہیں ــــ" خالدہ نے کانٹے کی نوک سے فرائی کیے انڈوں کا ایک ٹکڑا اپنے مُنھ میں ڈال لیا ــــ
التمش انگور کے چند دانوں کو مُنہ میں ڈال کر اس کا رس گھونٹ کر بولا ــــ
"میڈم ــــ کیاریوں میں لگے ہوئے یہ رنگ برنگ کے پھول بڑے دیدہ زیب ہیں اور ان سے پھوٹتی ہوئی خوشبوئیں تھکے ہوئے دماغوں کو تازگی بخشتی ہیں ــــ"
"تو پھر تم روز آیا کرو ــــ میرا بھی کچھ وقت مزے سے گذرے گا ــــ" خالدہ دھیرے

دھیرے بند کلی کی طرح کھلتی جا رہی تھیں ___ ٹھیک اسی وقت سیاہ چمکیلے پروں کا ایک بڑا مُرغ سائبان سے اچھل کر بے تحاشا جنون میں دوڑتا ہوا ایک مُرغی کو اپنی چونچ سے مغلوب کر کے اُس کی پُشت پر سوار ہو گیا ___ مُرغ جب اس کی پُشت سے اُتر گیا تو سہمی ہوئی مُرغی نے اپنی خفت مٹانے کے لیے اپنے ڈینوں کو پھیلا کر کئی بار جھاڑا اور کچھ چُن کر کھانے لگی ___ التمش اور خالدہ کی نگاہیں واردات سے جیسے ہی پلٹیں تو دونوں کی نگاہوں میں ٹکراؤ ہوا ___ اور دونوں کے چہرے پر سُرخیاں جھلک پڑیں ___

"میڈم ......"

"پھر تم نے مجھے میڈم کہا، صرف خالدہ کیوں نہیں کہتے ___ ؟" خالدہ نے بڑی بے باکی سے ٹوک دیا ___

"لیکن ایک فرق ضرور ہے خالدہ کہ ہم ایک دوسرے کو رضا کے بغیر پا نہیں سکتے ہیں اور جو رضا کی اہمیت کو نظر انداز کر کے قرب پا لیتے ہیں وہ قانون کی نگاہ میں مُجرم بن جاتے ہیں" التمش نے کہا ___

"تمہاری یہ بات کافی وزن رکھتی ہے ___ اب یہ بتاؤ کہ تم رہنے والے کہاں کے ہو ___ ؟ تمہارے والدین کہاں ہیں ؟" ___ خالدہ نے پوچھا ___

"مَیں خود نہیں جانتا ہوں کہ رہنے والا کس دیار کا ہُوں ___ ! اپنے بچپن کے ایام میں جب میں کوڑے پر اپنی قسمت کی تاریکی اور انسان کی انتہائی ذلت پر چیخ چیخ کر رو رہا تھا تو خدا کا کوئی نیک بندہ مجھے ایک یتیم خانہ میں ڈال دیا ___ وہیں بچپن کے دن گذرے ___ میٹرک فضیلت سے پاس کرنے کی وجہ سے سرکاری وظیفہ پانے کا حق دار بن گیا اور میرا حوصلہ کٹھن ڈگرے گذر کر مجھے باعزت ملازمت کی کرسی پر لے آیا ___" التمش نے اپنی زندگی پر پڑے تمام پردوں کو گرا دیا ___

"تمہارے حوصلے کی پختگی جان کر میری نظروں میں تمہاری عزت اور بھی بڑھ گئی ___ چلو ڈرائنگ روم میں بیٹھا جائے ___" اور دونوں ڈرائنگ روم میں آ گئے، ڈرائنگ روم کی سجاوٹ

قابلِ دید تھی ۔۔۔ دل بستگی کے تمام لوازمات موجود تھے ۔۔۔

التمش ایک لچک دار صوفے پر بیٹھا ہوا بولا ۔۔۔

"تم نے ڈرائنگ روم کو آراستہ کرنے میں دل کھول کر خرچ کیا ہے ۔۔۔"

"ایک بھائی تھا، اس کی موت کے بعد میں بھی تمہاری طرح بھری دنیا میں تن تنہا ہوں ۔۔۔ تنخواہ کی موٹی رقم خرچ کردوں تو کس کی ذات پر ۔۔۔ اپنے دل کی چاہتیں پوری کرتی رہتی ہوں ۔۔۔" اسی صوفے پر خالدہ بھی بیٹھ گئیں ۔۔۔ باتیں ہوتی رہیں ۔۔۔ قربت بڑھتی رہی ۔۔۔ فاصلہ گھٹنے لگا ۔۔۔ اور جب التمش وہاں سے واپس ہوا تو اس کے دل میں امید کی کرن پوری طرح پھوٹ چکی تھی ۔۔۔ اس کے بعد کی ملاقاتوں نے اتنے مواقع بخشے کہ اس نے خالدہ کو اپنا گرویدہ بنالیا ۔۔۔ اور قول و قبولیت کا اقرار کر کے دونوں ازدواجی زندگی کی ڈوری میں بندھ گئے ۔۔۔

وہ حسین سپنے جو التمش پہلے دیکھتا رہا تھا ۔۔۔ چار سال تک پورے کرتا رہا ۔۔۔ خالدہ کی اپنی کار تھی، شاپنگ ہو یا فلم، سیر و تفریح ہو یا کوئی پارٹی میں شرکت، دونوں پھول اور بھونرے کی طرح ساتھ ساتھ رہتے ۔۔۔ اس دوران دونوں کے جذبات کے بہاؤ نے خالدہ کی کوکھ سے دو بچوں کو جنم دے دیا، پہلا بچہ جب پانچ سال کا ہوا اس وقت تک تولید کے اثرات اور عمر کے بھار سے خالدہ کا جاذب نظر جسم ڈھیلا ڈھالا ہو کر بدنما لگنے لگا ۔۔۔ کمر چوڑی ہو کر پھیل گئی ۔۔۔ چہرہ کا روغن اڑ گیا ۔۔۔ اور خالدہ میں یہ ظاہری بدلاؤ پیدا ہو جانے سے التمش ساتھ آنے جانے سے کترانے لگا ۔۔۔ شام کے مشاغل میں کلب جانا اس کا روز کا معمول بن گیا اور جب اس کا ساتھ دینے خالدہ وہاں گئیں، التمش کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر کلب سے نکل جاتا ۔۔۔ کئی بار ایسا بھی ہو چکا تھا کہ خالدہ بچوں کے سو جانے کا بڑی بے صبری سے انتظار کر کے وہ التمش کے بستر پر گئی، اور جھلاہٹ کا شکار ہو کر لیٹی ہوئی بولی تھیں ۔۔۔ حالانکہ یہی التمش پہلے موقع پاتے ہی چیتے کی طرح اسے دبوچ لیتا تھا ۔۔۔ اور وہ ہانپتے ہانپتے بے سدھ ہو جاتی تھیں، اور اب یہ حال تھا کہ کئی راتوں تک مسلسل کوششوں کے باوجود ان کی آگ سرد نہ ہو پائی تھی ۔۔۔ ایک رات ایسی بھی آئی کہ خالدہ کے جسم کے اندر کی آگ بڑی تیزی سے لپکی ۔۔۔ اور وہ التمش کے بستر پر پہنچ گئیں، عورت کے تمام

حربوں کو آزماتے ہوئے التمش کو آمادۂ پیکار کرنے کی کوششیں کیں ۔ لیکن جب وہ گرم نہ ہو سکا تو خالدہ نے بڑی نرمی سے کہا ۔

"تمھیں کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے ۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ۔"

"تو میرے ساتھ یہ سرد مہری کیوں ۔ ؟"

"سچ کہتا ہوں مجھے خود معلوم نہیں ۔ پچھلی رات میں نے دل سے تمھارا پورا تعاون کرنا چاہا ۔ تم نے بھی کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ۔ اس کے باوجود بھی میرے دماغ کے اس کونے سے کوئی بارود نہیں نکلا ۔ تو میرا کیا دوش ۔ ؟ حقیقت یہ ہے خالدہ کہ عورت کے جسم کی جاذبیت اور کشش مرد کے دماغ میں وہ ایندھن ڈالتی ہیں جس سے وہ بےخود ہوتا ہے ۔"

خالدہ خاموشی سے اٹھیں اور اپنے بیڈ پر لیٹ کر ساری رات جاگ کر سوچتی رہیں کہ التمش کو کس طرح پرانی ڈگر پر لایا جائے ۔ جس سے ان کی زندگی میں پھر بہاریں لوٹ آئیں اور وہ کوئی فیصلہ کر کے پُرسکون ہو گئیں ۔

اگلے دن خالدہ نے اپنے بچوں کو اسکول کے ہوسٹل میں ڈال دیا ۔ دفتر سے فرصت لے کر کئی گھنٹوں تک ایک بیوٹی پارلر میں اپنے چہرے کو مصنوعی رنگ و روغن سے سنوارتی نکھارتی رہیں ، اور وہاں سے نکلیں تو مطمئن تھیں کہ آج رات جب وہ بیڈ لائٹ کی ہلکی روشنی میں دوسری جادو فسوں چھوڑیں گی تو التمش خود بہ خود اپنی پرانی ڈگر پر چل پڑے گا ۔

رات کی تاریکی پھیلتے ہی انھوں نے وی سی پی کے اندر ایک کیسٹ ڈال کر ٹیلی ویژن اون کر دیا ۔ اس کے اسکرین پر بلو فلم چلنے لگی ۔ مرد اور عورت کے جنسی خرافات کا عمل پوری وضاحت سے جاری تھا ۔ التمش اپنے چہرے کا رُخ ٹیلی ویژن کی طرف کیے ہوئے تھا ۔ خالدہ بھی اسی بیڈ پر اس کے جسم سے لگ کر بیٹھ گئیں ، ان کے جسم پر ایک باریک ریشمی نائٹ گون تھا اور بلو فلم کے اثرات سے مغلوب ہو کر انھوں نے جوں ہی وہی طریقہ اپنانا چاہا یکایک دروازہ پر زور کی دستک ہوئی ۔

"کون ــ؟" ــ انتہائی جھلاہٹ سے خالدہ نے پوچھا ــ

"میں ہوں میڈم ــ الکا ــ بڑے صاحب نے ایک ضروری کاغذ پر آپ کا دستخط لینے کے لیے بھیجا ہے ــ"

خالدہ دھیمی آواز میں التمش سے بولیں ــ

"میں باتھ روم سے کپڑے بدل کر آتی ہوں ــ تم ٹیلی ویژن بند کر کے دروازہ کھول دو۔"

التمش ٹیلی ویژن بند کیے بغیر جا کر دروازہ کھول آیا اور الکا اندر داخل ہو کر ٹیلی ویژن کے سامنے کھڑی ہو گئی اور جب التمش دروازہ بند کر کے الکا کے قریب پہنچا تو اس کے ہونٹوں پر پیاس کی لہر دیکھ کر وارفتگی کے عالم میں اس نے اُسے اپنے بیڈ پر کھینچ لیا ــ الکا کی طرف سے کوئی مدافعت نہ ہوئی ــ اور کمرے میں سانس بھاتیوں کی طرح کئی رنگوں میں ابھرنے لگی ــ

خالدہ لباس بدل کر جب کمرے میں واپس آئیں تو التمش اپنے بیڈ پر آنکھیں بند کیے خاموش پڑا تھا ــ، اور الکا کھڑی ہانپتی ہوئی اپنے بلاؤز کا بٹن لگا کر ساڑی کو سنوارنے میں لگی تھی ــ

خالدہ سب کچھ سمجھ کر اپنے غصہ پر قابو پا کر بولیں ــ

"کاغذ لگا ــ دستخط کر دوں ــ"

الکا کے جانے کے بعد خالدہ نے اپنے سر کو دیوار پر دے مارا اور فاسد خون جو سر سے اُبل کر نکلا تھا، اپنے ہاتھ میں لگا کر التمش کے چہرے پر مل دیا ــــ!

□□□

احساسِ جُرم

اپنے ملک اور بیرون ممالک میں عورتوں کے قتل کی وارداتیں اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہیں۔ جہاں اپنے ملک میں اس کے دو کارن واضح طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ پہلا جہیز کی لعنت ہے جس کے صدقے جوان عورتیں نت نئے طریقوں سے زیرِ خاک کی جاتی ہیں، دوسرا محرومیٔ عشق کی وحشت میں انتقامی جذبوں کے تحت مار ڈالی جاتی ہیں۔ لیکن بیرون ممالک میں عورتوں کے قتل کے وجوہ مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً ہانگ کانگ میں بیس جوان عورتوں کی لاشیں سڑکوں پر برہنہ پائی گئی تھیں اور ہر عورت کے ساتھ مجرم نے اپنی ہوس کی تشنگی بجھانے کے بعد اس کا قتل کیا تھا۔ اور مجرم کی گرفتاری کے بعد کے بیان سے اس کا وہ خول جھلک پڑا تھا جو اس کی بیوی کے ساتھ پیش آئے ہوئے حالات کے ردِعمل میں اس کے دماغ میں پھوٹ پڑا تھا۔ اسی طرح اٹلی کے اخبارات میں ایسی خبریں چھپی تھیں جن سے ساری دنیا لرز اٹھی تھی۔ محض دس دنوں کے مختصر سے وقفے میں وہاں تیس جوان عورتیں قتل کر دی گئی تھیں اور مجرم کا مقصد نہ لُوٹ تھا، نہ جنسی بھوک۔ بلکہ صرف اذیت رسانی کے ساتھ ہلاکت تھی اور یہ خبط ایک عورت کے قرب سے پیدا شدہ جھلاّہٹ نے اُس مجُرم میں پیدا کر دیا تھا۔ اسی طرح بنگلور میں بھی دس جوان خوب صورت عورتیں قتل کر دی گئی تھیں اور اس کے اثر سے سارے شہر

میں سراسیمگی کا دھواں پھیل گیا تھا۔ عام شہری کی انگلیاں بھی پولس محکمے کی کوتاہیوں کی طرف اٹھنے لگی تھیں۔ پولس کے اعلیٰ افسران بھی پریشان تھے اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مجرم کا مقصد لاکھ چھان بین کے بعد بھی واضح نہ ہو سکا تھا۔ کیونکہ مقتولوں کے جسموں سے نہ قیمتی زیورات اتارے گئے تھے۔ نہ میڈیکل رپورٹ سے اس بات کی تصدیق ہو سکی تھی کہ ان عورتوں کی اموات سے پہلے جنسی بھوک مٹائی گئی تھی۔ نہ ان کے قتل کا جہیز سے کوئی تعلق تھا نہ رقابت تھی۔ نہ ان کے جسموں پر اذیت رسانی کے داغ تھے۔ صرف ان سب کا قتل ریوالور کی گولیوں سے کیا گیا تھا۔ اور وہ سب جوان اور خوب صورت عورتیں تھیں۔

عوام نے پولس کی کارکردگی سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے لیے جلسے کیے، جلوس نکالے جس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلا کہ پولس کا خفیہ محکمہ حرکت میں آگیا اور جب فریڈرک کی گرفتاری کی خبر آگ کی طرح پھیلی تو اس کو ایک نظر دیکھنے کے لیے پولس چوکی کے قریب عوام کا مشتعل ہجوم جمع ہو گیا جس پر قابو پانے کے لیے اپنے تمام طریقوں کو بروئے کار لانے کے بعد بھی جب پولس کے عملے کامیاب نہ ہو سکے تو مجبوراً آنسو گیس چھوڑ کر انھیں منتشر ہوتے پر مجبور کیا گیا۔

فریڈرک اپنی گرفتاری کے بعد پتھر بنا چپ تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے کی طرح سرخ تھیں اور کبھی کبھی وہ اپنے داہنے ہاتھ کو بڑی شدت سے گھمانے لگتا تھا۔ پولس کے ذہین افسر بھی جب اپنے تمام حربوں کو آزما کر فریڈرک کو لب کشائی پر آمادہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو نفسیات کے ماہر ڈاکٹروں کے مشورے سے جج نے کچھ دنوں کے لیے فریڈرک کو مینٹل ہسپتال میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا۔

مینٹل ہسپتال کے اندر آنے کے بعد بھی فریڈرک میں کوئی تغیر رونما نہ ہوا۔ اکثر اس کا کھانا سیل کے اندر اس کے ہاتھ لگائے بغیر اسی طرح رہ جاتا تھا۔ کبھی کبھار دو چار لقمہ وہ اپنے حلق کے اندر اتار لیتا۔ اس کی آنکھیں اسی طرح سرخ تھیں اور اس میں درندگی اور سفاکی کی لہر دوڑتی رہتی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ اب بھی کبھی کبھی بڑی تیزی سے گھومنے لگتا تھا جیسے کہ وہ اس سے کوئی اہم کام انجام دے رہا ہو۔ اس کے معالجوں میں ڈاکٹر نرملا اور بڑے ڈاکٹر ذاتی طور پر

دل چسپی لے رہے تھے کیوں کہ پولس کے خیال سے ان دونوں کا اختلاف تھا۔ پولس کے افسران اس نظریے پر پوری طرح متفق تھے کہ مجرم کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے صرف اس کے پاگل پن کا ڈھونگ رچانے کا ایک حربہ بچا تھا جو اس کو موت سے بچا کر کسی طرح سے زندہ رہنے کا موقع بخش سکتا تھا اور وہ اس حربے کو استعمال کر رہا ہے کیوں کہ وہ ریوالور مجرم کے پاس سے برآمد کر لیا گیا تھا جس سے اس نے قتل کی وارداتیں کی تھیں اور شناخت کے پریڈ میں بھی عینی شاہدوں نے فریڈرک کو پہچان لیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر نرملا اور بڑے ڈاکٹر دونوں اس کی سرخ آنکھیں اور یکایک گردش کرنے والے ہاتھ کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں لگے تھے، آج بھی جب وہ دونوں فریڈرک کے سیل کے سامنے پہنچے تو فریڈرک بڑے ڈاکٹر کے سوال کا جواب دینے کی بجائے ڈاکٹر نرملا پر اپنی نگاہیں جمائے چپ کھڑا رہا، ڈاکٹر نرملا جوان تھیں، خوب صورت تھیں۔ ڈاکٹر نرملا کو جب فریڈرک کی حرکت کا احساس ہوا تو وہ یکایک خوف زدہ ہو گئیں۔ لیکن انھوں نے اپنے دل میں چھپائے ہوئے خوف کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ اور زیرِ لب مسکراتی ہوئی بڑے ڈاکٹر سے بولیں ۔

"فریڈرک کو نہ پوری طرح پاگل کہا جاسکتا ہے اور نہ ہوش مند ، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کوئی اَن ہونی بات سے اس کے عمل کا گہرا تعلق ضرور ہے ۔ جس نے اس کے نفسیات پر اتنا اثر ڈالا ہے کہ اس کا دماغ صرف ایک مرکز پر آکر وقتی طور پر ٹھہر گیا ہے ۔"

"مَیں بھی اسی خیال پر اٹک کر اس کا علاج سوچ رہا ہوں" ۔ بڑے ڈاکٹر نے کہا۔ اور پھر وہ دونوں تمام وارڈوں اور سیلوں کا معائنہ کرنے کے بعد اپنے چیمبر میں لوٹ آئے ۔

اسی رات ڈاکٹر نرملا جب اکیلی اپنے کمرے میں صوفے پر پاؤں پھیلائے لیٹی ہوئی نفسیاتی علاج کے جدید طریقوں پر لکھی ہوئی کسی طبی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھیں تو یکایک تیز جھٹکے کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر نرملا کی نگاہیں اس سمت مڑیں تو انھوں نے دیکھا کہ فریڈرک کھڑا انھیں خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، ان کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون احساسِ خوف سے

منجمد ہونے لگا۔ لیکن پچھلے سال طرح طرح کے پاگلوں کو دیکھ کر اور ان کے نفسیاتی علاج کے طریقوں کو جان کر وہ پوری طرح سمجھ چکی تھیں کہ پاگلوں سے کس طرح نپٹنا چاہیئے۔ لہٰذا انھوں نے صوفے پر اپنے پاؤں کو سمیٹتے ہوئے بڑی سادگی اور سکون سے فریڈرک سے کہا۔

"فریڈرک کھڑے کیوں ہو۔؟ آؤ بیٹھو۔"

فریڈرک کچھ جواب دیئے بغیر اسی طرح کھڑا رہ کر ڈاکٹر نرملا کو غور سے دیکھتا رہا۔

"اچھا ٹھہرو۔ میں تمھارے لیے کافی لاتی ہوں۔"

ڈاکٹر نرملا اطمینان سے اٹھ کر نہایت آہستگی سے دوسرے کمرے میں آئیں، ٹیلی فون ان کی قیام گاہ پر تھا نہیں، نکاسی کے واحد راستہ پر فریڈرک جما کھڑا تھا، چیخنے سے فائدہ ہونے کا امکان کم اور نقصان کا خدشہ زیادہ تھا۔ تمام امکانات پر ایک پل میں غور کرنے کے بعد انھوں نے الماری سے ریوالور نکال کر کمر کے پاس اپنی ساڑی میں کھونس لیا اور پھر کافی تیار کر کے جب وہ پھر اسی کمرے میں آئیں تو فریڈرک اسی طرح بُت بنا جوں کا توں کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نرملا کافی کی پیالی ٹیبل پر رکھ کر اس کے قریب گئیں اور اس کا وہ ہاتھ جو اکثر مشین کی طرح گھومنے لگتا تھا، تھام کر بڑے پیار سے بولیں۔

"تم میرے چھوٹے بھائی جیسے ہو۔ اور میرے بھائی نے آج تک میرے حکم کو خوش دلی سے قبول کیا ہے۔" ڈاکٹر نرملا کا پیار پا کر وہ صوفے پر بیٹھ کر کافی کی چُسکیاں لینے لگا ڈاکٹر نرملا نے کن انکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ اس کی آنکھوں کی سُرخی پہلے سے کچھ کم ضرور تھی۔ کافی کے بعد فریڈرک نے جب خالی پیالی ٹیبل پر رکھ دی تو ڈاکٹر نرملا پھر بولیں۔

"تم اپنی بہن سے کچھ نہ بولوگے؟"

"کیا بولوں۔؟ بولنے کے لیے اب بچا ہی کیا ہے۔؟"

جو زبان برف کی ٹھنڈک اور برقی لہروں کے جھٹکوں سے نہ کھل سکی تھی۔ پیار نے اس کو آواز بخش دیا تھا۔

"ابھی ساری زندگی تمہارے آگے پڑی ہے ۔، جو کچھ تم نے جانے انجانے میں کیا ہے وہ سنگین جرم تھا ۔ اور جن حالات نے تمھیں جرم پر اکسایا تھا جب تک تم اپنی بہن کو نہ بتاؤ گے وہ تمہاری بھلائی کے لیے کچھ کرنا بھی چاہے تو کس طرح کر پائے گی ۔ ؟" ڈاکٹر نرملا نے انتہائی متانت سے کہا ۔

"میں جانتا ہوں کہ میری موت میرے سامنے کھڑی مجھے بلا رہی ہے ، پھر بھی آپ نے مجھے بہن کا جو پیار دیا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ آپ سے کچھ نہ چھپاؤں ۔، میں تعلیم کی روشنی پاکر انسانیت کی قدروں سے واقف ہوں ۔، اچھائی اور برائی کے فرق کو سمجھتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ جنونی کیفیت کے زیر اثر جو کچھ مجھ سے سرزد ہوا ہے وہ ناقابلِ معافی جرم ہے ۔، میں نے ہر جوان عورت کو اپنی سوتیلی ماں کی طرح ذلیل اور ریاکار سمجھا تھا ۔ جو اب میرا وقتی پچھتاوا بن کر میرا گلا گھونٹ رہا ہے ۔"

فریڈرک چند منٹ تک چُپ ہو کر کچھ سوچتا رہا ۔ اس کی نگاہیں ندامت کے بوجھ سے جھکی رہیں ۔، پھر دل میں اٹھتے ہوئے جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا امنڈ آیا ۔ ڈاکٹر نرملا نے اس کے قریب ہو کر اپنی ساڑی کے پلو سے اس کے آنسوؤں کو پونچھا اور ان کے اس انداز محبت سے فریڈرک کے دل کو جب قرار ملا تو وہ یوں گویا ہوا ۔

"میرا باپ بحری جہاز کا کپتان ہے ، سال میں کُل تین مہینے وہ گھر پر گذارا کرتا ہے ، میری ماں کی موت کے بعد جب وہ کئی ممالک سے گھوم کر واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک جواں سال خوب صورت عورت تھی جس سے انھوں نے ہانگ کانگ میں شادی کر لی تھی ، میں بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوا تھا کیوں کہ اپنی ماں کی موت کے بعد باپ کی غیر موجودگی میں دن تو میرا کالج میں کسی نہ کسی طرح گذر جاتا تھا ۔، لیکن ہر رات میرے لیے قیامت بن کر آتی تھی ۔، اپنے بڑے بنگلے کے ایک کمرے میں ماحول کے سناٹے میں مجھے ماں کی یاد آکر بری طرح تڑپا دیتی تھی ۔ میں بے چین ہو کر رو رو کر تھک کر سو جاتا تھا ۔، اور کبھی ساری رات جاگ کر گذار دیتا تھا ۔، لیکن ماریا جو میری ماں کا درجہ لے چکی تھیں ان کے آجانے سے میں نے سوچا تھا کہ اب باپ کی

غیر حاضری میں بنگلے کا سونا پن میری پریشانیوں کا سبب نہ بن سکے گا کیونکہ بالکل ماں کی طرح وہ بھی میرا خیال رکھتی تھیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کا پیار پا کر میں اپنی حقیقی ماں کو بھولنے لگا تھا ۔ ہمیشہ کی طرح میرا باپ اپنے جہاز کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گیا تھا ۔ بنگلے میں میری سوتیلی ماں اور میں تھا ۔ جس کمرے میں میرا قیام تھا اس سے ملحق میری سوتیلی ماں کا کمرہ تھا ۔ جس کا ایک دروازہ میرے کمرے میں کھلتا تھا ، لیکن وہ ہمیشہ بند رہتا تھا ۔ دوسرا دروازہ جو آنگن میں کھلتا تھا آمدورفت کا راستہ تھا ۔ باپ کی روانگی کے تین چار دنوں بعد ایک رات جب میں امتحان کی تیاریوں میں لگا تھا تو خلافِ توقع چرچراہٹ کے ساتھ وہ دروازہ کھل گیا جو ہمیشہ بند رہتا تھا اور میری سوتیلی ماں ماریا باریک سلیپنگ گون پہنے میرے سامنے آ کر بیٹھتی ہوئی بڑے جذباتی انداز میں بولیں ۔

" تم بہت خوب صورت ہو فریڈرک ۔ اگر تم ہانگ کانگ میں ہوتے تو اب تک نہ جانے کتنی عورتوں کے شکار بن گئے ہوتے ۔ "

" سوتیلی ماں کی باتیں سن کر میرا دماغ سن سے ہو گیا ۔ لیکن میں نے سوچا کہ وہ زیادہ پی کر خود پر قابو پا رکھنے سے قاصر ہیں ۔ لہٰذا میں نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا ۔ "

" میں تمھارا بیٹا ہوں ۔ تمھیں ایسی گندی باتیں مجھ سے نہیں کرنی چاہیئں ۔ "

" میں نے تمھیں اپنا بیٹا دل سے کبھی نہیں مانا ہے ۔ " وہ مجھ سے اور قریب ہو گئیں ۔

" پھر تم نے مجھے مانا کیا ہے ۔ ؟ " میں نے پوچھا ۔

" یکایک وہ میری گردن کو اپنی ننگی باہوں کے سخت حلقے میں لے کر میرے ہونٹ کو اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں میں دبا کر چوسنے لگیں ، بہت ممکن تھا کہ شرافت کا دامن میری گرفت سے چھوٹ جاتا کہ یکایک مجھے ماں یاد آ گئی ۔ اس کی ممتا کی پاکیزگی ، تقدس کی عظمت اور پیار کے دور کا تصور جب میرے ذہن میں بجلی کی طرح چمکا تو میں نے اپنے ہاتھوں میں اپنی پوری طاقت سمیٹ کر اتنی شدت سے انھیں جھٹکا دیا کہ وہ دور جا گریں ، اور میں بدحواس ہو کر انھیں تکتا رہا ۔ وہ گر پڑی تھیں اور ان کی پیشانی پر لگی ہوئی چوٹ سے خون ابل کر چہرے پر پھیل گیا ، پھر نہ جانے

کیوں ہمدردی کا جذبہ میرے دل میں اُبھر آیا ۔۔ میں نے اسپرٹ لاکر روئی سے ان کے زخم کو صاف کیا اور پھر اپنا رومال ان کے زخم پر باندھ دیا ، اس دوران وہ اپنی نگاہیں جھکائے بالکل خاموش رہیں ۔ میں نے انتہائی احترام سے ان کا ہاتھ تھام کر ان کے کمرے میں لے جاکر لٹا دیا ۔ اور کمرے میں واپس آکر دونوں دروازوں کو اپنے کمرے کی طرف سے بند کر دیا ۔۔۔ وہ رات میری زندگی کی سب سے زیادہ تکلیف دہ رات تھی ۔ میرا دماغ ساری رات کبھی عورت کے کردار کی عظمت ۔۔۔ اس کی پاکیزگی ۔۔۔ زندگی کو بخشنے والے ارتقا ۔۔۔ اور کبھی اس کی ذلت سے چمٹی ہوئی گراوٹ ۔۔۔ گندگی اور شہوانیت کے گھناؤنے پن کے متعلق سوچتا رہا تھا۔

پھر دو تین دنوں تک سوتیلی ماں سے میری کوئی بات چیت نہ ہوئی ، لیکن وہ ہمیشہ کی طرح میری ضرورتوں اور آرام کا خیال کرتی رہی تھیں ۔۔۔ اور پھر ایک صبح جب مَیں جاگا تو میں نے خود کو ان کے بستر پر ننگا پایا تھا ۔۔ اور وہ میرے جسم سے آسودگی پاکر بے خبر سوئی تھیں ۔۔۔ ، یکایک میں پوری طرح سمجھ گیا کہ انھوں نے مجھ پر قابو پانے کے لیے رات کیک میں کوئی نشیلی دوا ملاکر کھلا دیا تھا ، کیونکہ کیک کھاتے وقت مجھے ایسی بُو کا احساس ہوا تھا جس سے پہلے مَیں آشنا نہ تھا ۔۔ لیکن مجھے اپنی سوتیلی ماں کے گھناؤنے ارادے کا مطلق گمان نہ تھا ۔۔ انھوں نے میرے ساتھ فریب کیا تھا ۔۔۔ مکّاری کی تھی ۔۔۔ پھر میرے دماغ نے لپک کر میرے وجود کو نرغے میں لے لیا تھا ۔۔ جنون کی کیفیت جب مجھ پر پوری طرح مسلط ہوگئی تو مجھے خود ٹھیک سے یاد نہیں کہ کس طرح میں نے لباس زیب تن کیے تھے ۔۔ باپ کا ریوالور نکال کر سوتیلی ماں کے جسم کے کس حصے پر گولی داغی تھی ۔۔ اور اپنے بنگلے کے کون سے دروازے سے فرار ہوا تھا ۔۔ لیکن یہ اب بھی مجھے یاد ہے کہ اپنی سوتیلی ماں کے قتل کے بعد میں صرف ان عورتوں کا قتل کرتا رہا ہوں جو میری نگاہوں میں سوتیلی ماں دکھائی دی تھی ۔۔۔ "

یکایک فریڈرک نے انتہائی پھرتی سے ڈاکٹر نرملا کی کمر سے ریوالور نکال لیا جو ان کی ساڑی کے آنچل کے سرک جانے کی وجہ سے اس نے دیکھ لیا تھا اور ریوالور کا رخ وہ ڈاکٹر نرملا کی طرف کرتا ہوا پُرسکون انداز میں بولا ۔۔

"میں آپ کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے بہن کا پیار دے کر میری جنونی کیفیت سے میرے دماغ کو پوری طرح آزاد کر دیا ہے ـــ لیکن جو جرم میں کر چکا ہوں اس کا احساس اتنا تلخ ہے کہ اب میں ایک پل جینا نہیں چاہتا ہوں ـــ مرنے سے پہلے کبھی ظاہر نہ ہونے دیں گی. ورنہ دُنیا کا کوئی بھی جوان بیٹا اپنی جوان سوتیلی ماں کو احترام کی نگاہوں سے کبھی نہ دیکھے گا ـــ"

اور فریڈرک نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر اپنا تحریری بیان لکھنے کے بعد تشکر بھری نگاہوں سے ڈاکٹر نرملا کو دیکھا اور پھر ان کے ریوالور کی گولی سے اپنی روح کو جسم کی قید سے آزاد کر دیا ـــ!

□□□

حادثہ

ایک ڈھلتی ہوئی رات میں اپنے بیڈ سے اُتر کر وہ اندھیرے میں دبے قدموں سے دوسرے کمرے میں چلا گیا ـــ

"تم نے مجھے بہت انتظار کرایا ـــ! نہ جانے شادی کے بعد مجھے کیوں نظر انداز کر رہے ہو ـــ"

"ایسی کوئی بات نہیں ـــ"

"تو پھر ـــ؟"

"یہ صرف تمھارے دماغ کی اُپج ہے ـــ"

"تم جانتے ہو نا پیاسی فصل ہمیشہ آسمان کی طرف نظریں ٹکائے رہتی ہے ـــ ٹھیک وہی حالت اس وقت ہماری ہے ـــ"

"یہ انداز گفتگو دونوں کو اور قریب لے آیا ـــ"

دونوں کی سانس ایک دوسرے کے جسموں پر انگلیوں کی طرح پھرتی ہوئی محسوس ہونے لگیں ـــ اور پھر ایک دوسرے میں مُدغم ہو گئے ـــ ' ایک دل خراش چیخ ـــ ' ڈاکٹر شیبا چونکتی ہوئی اپنے خوابوں کے حصار سے باہر نکل آئی ـــ حقیقت کو گرفت میں لینے کے لیے اس کا

اس کا ذہن کوشاں تھا ۔ کہ دم توڑتی گھٹتی سی آواز پھر ابھری ۔ وہ جلدی سے بیڈ سے اتری،
اور تیزی سے بھاگتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہو گئی ۔ جو کچھ بھی وہاں اس نے دیکھا وہ کانپ گئی۔
اس کا شوہر فرش پر چت پڑا تھا اور اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا ۔ وہ ڈاکٹر تھی ۔ سمجھ گئی کہ ایسے
میں B.P بڑھنے سے Brain Hammerage ہوتا ہے ۔ اس نے جلدی سے شوہر
کے دل کے پاس ہاتھ رکھا، لیکن اس وقت تک دل کی حرکت بند ہو چکی تھی ۔ اتنا وقت بھی نہ مل
سکا کہ وہ میڈیکل ایڈ دے سکے ۔ وقت کی اس کروٹ پر وہ حیران تھی ۔ اس نے حقارت بھری
نظروں سے ماں کو دیکھا ۔ اس کی نظریں جھکی جھکی ہوئی تھیں اور بت کی طرح خاموش تھی ۔ اس
کے بال بکھرے ہوئے تھے ۔ اس کا نصف ننگا جسم گذری ہوئی کہانی اُگل رہا تھا ۔ ماں اور
شوہر کی اس حرکت پر وہ ندامت سے کانپ گئی ۔ وقت کا یہ کھیل کتنا عجیب تھا ۔ !

میڈیکل کالج میں اپنی تعلیم کے دوران ایک خوابوں کا محل اس نے اپنے ذہن میں تعمیر کیا تھا
ڈاکٹر اشرف کی طرف وہ پوری طرح مائل تھی ۔ لیکن ان تعلقات کے درمیان خاندانی شرافت دیوار
بنی رہی تھی ۔ کبھی وہ دونوں اُنسیت سے آگے بڑھ کر لگاؤ کے دائرے میں داخل نہ ہو پائے تھے،
اور تعلیم کے اختتام پر وہ دونوں کچھ چاہ کر بھی کچھ نہ پا سکے تھے ۔ اس کا ذہن جو تازہ زخم سے خون
آلود تھا ۔ بہت زور سے پھڑپھڑایا اور ماضی کی ڈگر تلاش کرنے لگا ۔ اسی وقت چند عورتیں
اس کو شوہر کے آخری دیدار کے لیے قریب لے گئیں ۔ اس کے ہونٹ بند تھے ، زبان چپ تھی ،
لیکن آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہہ رہا تھا ۔ لاش اٹھانے کے منظر کو دیکھ کر اس کے دل
میں ایک ہوک سی اٹھی اور وہ ایک دل خراش چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو گئی ۔ ہوش میں آنے
کے بعد اس کے ذہن کے پردے گذرے ہوئے حالات کے بادل جمائے ہوئے تھے ۔ اپنی
تعلیم کے ایام میں جب جب بھی رات کی شفٹ میں ڈاکٹر اشرف کے ساتھ اس کی ڈیوٹی ہوئی تھی،
اکثر دونوں اپنے اپنے مریضوں کی بگڑی ہوئی حالت کے متعلق دواؤں کے بارے میں تبادلہ خیال کیا
کرتے تھے اس طرح دونوں کے درمیان اُنسیت پھلی پھولی ۔ لیکن لگاؤ کے لمبے راستے پر ایک قدم
دونوں نہ بڑھ سکے تھے ۔ جس تہذیب اور ادب کی چھاؤں میں دونوں بڑے ہوئے تھے ،

وہاں تہذیب کا حصار بڑا تنگ تھا، پر یہ بھی سچائی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو قبول کرنے کے لیے دل سے آمادہ تھے۔

تعلیم ختم کرنے پر دونوں ایک دوسرے سے محبت اچھالتے ہوئے جدا ہوئے تھے۔ ہاؤس مین شپ مکمل کرنے کے بعد جب وہ گھر لوٹی تو ماں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ قندیلیں روشن کی گئی تھیں جو عید کے موقع پر روشن کی جاتی ہیں۔ اس نے حویلی میں بہت سی تبدیلیاں محسوس کیں، جیسے، ماں پہلے بجھی بجھی سی خاموش رہتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کو ملتی تھی۔ لیکن اب وہ ہر وقت سجی سنوری اور پھولوں کی طرح کھلتی نظر آتی تھی۔ اس حویلی میں اس کی ماں اور دو کنیزوں کے علاوہ ایک نوجوان کا اضافہ بھی دیکھنے کو ملا، وہ نوجوان عارف حسن انجینیئر تھا۔ ماں نے اس نوجوان سے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ تعارف کرایا تھا۔ اور کچھ ہی دنوں کے بعد ماں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ڈاکٹر شیبا نے اس کو اپنا شریکِ حیات بنالیا تھا۔

وقت کے ساگر میں حیات کی ناؤ تیر رہی تھی کہ یکایک اس کی ناؤ بھنور میں پھنس گئی۔ یہ احساس زہر سے زیادہ تلخ اور جان لیوا تھا۔ وہ سسکنے لگی، روتی رہی۔ لیکن اس کی ماں اس کے پاس نہیں آئی، شاید اس کا جرم اس کے وجود کو مسل رہا ہو۔ تین دنوں سے ماں سے بات کیے بغیر اس حویلی میں رہی جہاں اس کا ماحول اس کی خوشیوں کا باعث رہا تھا۔ ہر پل وہ وہ مسرور رہی تھی۔ لیکن اب اس حویلی میں اس کے لیے کچھ نہ بچا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ کھو چکی تھی۔

چوتھی رات اس کے لیے بڑی کٹھن رات تھی، وہ اپنی زندگی کے متعلق اہم فیصلہ کرنے میں جٹی ہوئی تھی۔ کیا وقت تھا اور اب کیا ہے۔ کتنا فرق آگیا تھا۔ ایسے حالات میں ماں کا وجود ممتا سے پُر ہوتا ہے۔ کالج بند ہونے پر جب جب وہ اپنی حویلی آئی تھی اس نے ماں کی خوشیوں کو محسوس کیا تھا۔ اور ظاہری طور پر بھی دیکھا تھا لیکن وہی ماں اس کی

بیوگی کے موقع پر چپ تھی، وجہ وہ جانتی تھی ۔ وہ سسک سسک کر پہروں روتی رہی۔ اس کا زخم خوردہ دل خون کے آنسو بن کر بہتا رہا ۔ وہ بہت دیر تک سوچتی رہی ۔ فیصلہ کرتی رہی ۔ ابھی اس کی زندگی کا ایک چوتھائی سفر ہی پورا ہوا تھا ۔ تین حصّہ ابھی باقی تھا ۔ اُس بچے ہوئے سفر کو بیوگی کے حوالے کرنے کے لیے اس کا دل راغب نہ تھا ۔ اس نے روتے سسکتے ہوئے ایک خط لکھ کر بستر پر رکھ دیا تھا ۔ اس حویلی سے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی ، ڈگمگا ڈگمگی چلنا سیکھا تھا ۔ جوان ہوئی تھی ۔ آج اس حویلی کو خیرباد کہہ رہی تھی ۔ امید کا آخری چھور اس کے ہاتھ میں تھا ، وقت کیا کروٹ لے گا وہ نہیں جانتی تھی ۔ رات نصف سے زیادہ گذر چکی تھی ۔ وہ ٹرین میں سوار ہو کر اپنی زندگی کے اُتار چڑھاؤ کے متعلق سوچنے لگی تھی ، پھر ماں کا جوں ہی خیال آیا وہ ہلک اٹھی ۔ اس کے دل میں ماں کے لیے نفرت کے علاوہ کچھ نہ تھا ۔ اس کی زندگی ماں کی وجہ سے تباہ ہوئی تھی ۔ نئی زندگی تلاش میں جس منزل کا اس نے انتخاب کیا تھا وہاں پہلے کبھی نہیں گئی تھی ، اس منزل پر ایک چراغ روشن تھا جس کی روشنی میں زندگی گذارنے کی آرزو مند تھی ۔ لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ اس روشنی کے دائرہ میں کسی نے اپنا آشیانہ بنا لیا ہوگا ۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے جسم میں کپکپی سی پیدا ہوگئی ۔ کس طرح اس کی زندگی نے کروٹ لی تھی ۔ جس کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا ۔!

اسٹیشن سے جاتے ہوئے اس کی ٹیکسی حادثہ کا شکار ہو گئی ، چوٹ آجانے سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی ، جائے حادثہ کے اردگرد کے مقامی لوگوں نے انسانیت کا فرض پورا کرتے ہوئے اس کو اسپتال میں داخل کرلیا تھا ۔ دو دنوں تک وہ موت اور حیات کے درمیان جھولتی رہی تھی ۔ ہوش میں آجانے کے بعد حالات اور ماحول کا اندازہ لگا کر وہ چونک اٹھی تھی ۔ ، اس کے دائیں پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی ۔ سب سے پہلے جس ڈاکٹر پر اس کی نظر پڑی تھی وہ ڈاکٹر اشرف تھا ۔ لب کشائی کے لیے جب اس کے ہونٹ ہلنے لگے تو ڈاکٹر اشرف نے اپنے لبوں پر انگلی رکھتے ہوئے چپ رہنے کا اشارہ کیا ، وہ اپنی نیم آنکھوں سے ڈاکٹر اشرف

کو دیکھ رہی تھی ۔۔۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں پلکوں کے غلاف سے ڈھکنے لگیں ۔۔۔
غنودگی کی حالت میں ڈاکٹر شیبا بار بار سر کو جنبش دے رہی تھی ، ڈاکٹر اشرف ذہنی طور پر سخت
پریشان تھا ۔۔۔ ایامِ تعلیم کے دوران سے وہ شیبا کو اپنی آرزوؤں کا مرکز بنانے کا متمنی تھا ۔۔۔ ،
لیکن دونوں ندی کے دو کناروں پر کھڑے تھے ۔۔۔

اسی رات یکایک ڈاکٹر شیبا کی حالت بگڑ گئی ۔۔۔ ڈاکٹر اشرف نے بڑے بڑے ڈاکٹر
کو بلا کر مشورہ کیا ۔۔۔ سب متفق خیال تھے کہ ڈاکٹر شیبا کے سر میں بھی چوٹ لگی ہے ۔۔۔ نرسوں نے
ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق ڈاکٹر شیبا کو آکسیجن لگایا اور اَنٹی بائٹک چڑھنا شروع کر دیا ۔۔۔ ،
ڈاکٹر اشرف ساری رات بستر کے قریب بیٹھے رہے ۔۔۔ اور خدا سے کچھ مانگتے رہے ۔۔۔ ،
رات گذرتے ہی ڈاکٹر اشرف قدرے پُرسکون ہو گئے ۔۔۔ ڈاکٹر شیبا خطرے کے دائرے
سے باہر نکل آئی ، ڈاکٹر شیبا نے جوں ہی اپنی آنکھیں کھولیں ۔ ڈاکٹر اشرف نے پوچھا ۔۔۔

"کیسی ہو شیبا ۔۔۔ ؟"

ڈاکٹر شیبا کے چہرے پر خزاں کی اُداسیاں پھیل گئیں ۔۔۔ اس نے شکایت بھرے
لہجے میں کہا ۔۔۔

" مجھے تم نے مرنے کیوں نہ دیا ۔۔۔ ؟"

" فرسودہ باتوں کو ذہن میں جگہ دے کر اپنے دماغ کو گندہ مت کرو شیبا ۔۔۔ میں
تم سے جدا ہو کر اپنی زندگی میں اَن گنت بار یہ محسوس کر چکا ہوں کہ میں اپنے آپ کا مجرم ہوں ۔۔۔ ،
بہر کیف ۔۔۔ یہ بتاؤ ۔۔۔ اس شہر میں کیسے آنا ہوا تھا ۔۔۔ ؟"

" جھوٹ بہت کچھ بول سکتی ہوں اور سچ بولنے کی ہمت نہیں ہے ۔۔۔" ڈاکٹر شیبا نے
نگاہیں جھکائے ہوئے کہا ۔۔۔

"تمھاری والدہ کیسی ہیں ۔۔۔ ؟" ڈاکٹر اشرف نے پوچھا ۔۔۔

"ٹھیک ہیں"۔۔۔ ڈاکٹر شیبا نے جز بز ہو کر مختصر سا جواب دیا ۔۔۔

" سنو شیبا ۔۔۔ یہ سچ ہے کہ میری زندگی تلذذ سے خالی ہے ۔۔۔ اور تمھارے بغیر

ابھی بھی نامکمل ہے ۔۔۔میں نے فیصلہ کیا تھا کہ تم سے اور تمہاری والدہ سے مل کر اپنی آئندہ زندگی کو سنوارنے کا جتن کروں گا کہ تم اس حال میں مجھے مل گئیں ۔۔۔"

ڈاکٹر شیبا کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو موتی بن بن کر گرنے لگے ۔۔۔

ڈاکٹر اشرف بے چین ہوتے ہوئے بولے ۔۔۔

"میں بہت شرمندہ ہوں شیبا ۔۔۔میرا مقصد تمھیں دکھ دینا نہیں تھا ۔۔۔ مجھے معاف کرنا۔"

ڈاکٹر شیبا نے بے اختیار ہو کر ڈاکٹر اشرف کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔

"ایسی کوئی بات نہیں ڈاکٹر ۔۔۔میرے زخم کو کریدنے کی کوشش مت کرو ۔۔۔میں اب تمھارے قابل نہیں ہوں"۔۔۔ ڈاکٹر شیبا کی آواز ڈوبی ہوئی تھی ۔۔۔

ڈاکٹر اشرف نے اپنا ہاتھ شیبا کے سر پر رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔

"تمھارے کل سے میرا کوئی تعلق نہیں شیبا ۔۔۔آج سے تم میری زندگی کی ساتھی ہو ۔۔۔"

ڈاکٹر شیبا کے دل کے اندر کی تاریکیوں میں امید کی کرن پھیلتی نظر آئی ۔۔۔اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کی لکیریں بکھر گئیں ۔۔۔ اور وقت نے ڈاکٹر شیبا کو حادثہ کے سہارے سب کچھ دے دیا ۔۔۔جس کی اس کو تلاش تھی ۔۔۔

□□□

لاجی

مَیں تھکن سے چور نڈھال اپنی سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبتا اُبھرتا ویٹنگ ہال کے ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر سر سے پاؤں تک چادر تانے ہوئے بیٹھا تھا ـــ

شعلہ کی طرح لپکتی ہوئی آواز اُبھری ـــ

"منہ تک چادر میں چھپائے ـــ ارے تو ہے کون ـــ ؟ لیکن تو ہے قسمت کا دَھنی، مُسافروں کا رکھوالا اور فقیروں، جیب کتروں کا دشمن ۔ اگر تجھے ایک کونے میں سکڑا ہوا دیکھ لیتا، تو کچھ جانے پوچھے بغیر ایک ڈنڈا تیرے بدن پر جما دیتا اور تجھے اپنی نانی یاد آجاتی ۔ بڑا اکھڑ ہے وہ ۔ عورتوں پر بھی رحم نہیں کرتا اور تجھے بھی گائے بکریوں کی طرح یہاں سے ہانک دیتا اور شکار کی کھوج میں چیل کوّوں کی طرح منڈلاتے ہوئے لفنگے تجھے دیکھتے ہی جھپٹ پڑتے ـــ"

مَیں نے اپنے سر سے چادر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا ـــ قریب دو ہاتھ کے فاصلے پر وہ اُکڑوں بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس کے چہرے پر رقصاں روغن بڑا دل کش تھا ـــ

"پھر تو کیا کرتی ـــ ؟"

"عورت ہو کر بھی مَیں گائے کا نہیں، شیرنی کا دل رکھتی ہوں ـــ ابھی کسی ماں نے ایسا بیٹا جنا نہیں ہے جو میری مرضی کے بغیر میرا بدن چھو لے ـــ" اس نے اپنی ساڑی میں اڑے

ہوئے دو دھاری چاقو کو نکال کر روشنی میں چمکاتے ہوئے کہا ___

" جب تک یہ چاقو میرے پاس ہے، مَیں ہر درندے کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے کی ہمت رکھتی ہوں ___"

اس کا بلند حوصلہ جان کر میری نگاہوں میں اس کا چہرہ اور زیادہ چمک اٹھا، اس کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش میرے دل میں اُبھری اور میں کھسک کر اس کے کچھ اور قریب ہو گیا ___ وہ یکایک اپنا تیور بدل کر غرّائی ___

" مَیں نے اپنا دو دھاری چاقو تجھے دکھا دیا تھا ___، پھر بھی تو میرے قریب کھسک آنے کی ہمت کیسے کر بیٹھا ___؟ "

" مجھے غلط مت سمجھ، مَیں تو اپنے دُکھوں کے بوجھ میں خود دبا ہوا ہوں ___، اور ہر دُکھی آدمی دوسرے کا دُکھ جان کر جینے کا چلن اپناتے ہیں ___، میرے دل کی بھی خواہش ہوئی کہ تیرے بارے میں کچھ اور جانوں ___ "

اس کے چہرے پر چھایا ہوا تناؤ ختم ہو گیا، بڑی سادگی سے بولی ___

" کیا جاننا چاہتا ہے ___؟ "

" تیرے ماں باپ کون ہیں ___، گھر بار کہاں ہے ___؟ "

" باپ کا پیار مَیں نے کبھی پایا ہی نہیں اور نہ اس کو کبھی دیکھا ہے ___، وہ کون تھا ___؟ شریف تھا یا لفنگا ___، میری ماں نے یہ مجھے کبھی جاننے نہ دیا ___، خیراتی اسپتال میں میرا جنم ہوا ___، ڈگمگا ڈگمگی دے کر اسی ویٹنگ ہال میں اپنے پاؤں چلنا سیکھا، ماں کے ساتھ رہ کر اسی ویٹنگ ہال میں پلی ہوں، جب مَیں چھوٹی سی تھی تو ماں، ایک بابو کے یہاں چوکا برتن کر کے میرے لیے کھانا لاتی تھی اور مَیں دن بھر اسی ہال میں موالی بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی ___ کبھی کبھی کسی مسافر کا چھوٹا موٹا کام کر کے پچیس پچاس پیسے کما لیا کرتی تھی اور اس سے مَیں اپنے ترستے ہوئے مَن کی پیاس بجھا لیتی تھی ___، آٹھ دس سال کی میری عمر جب ہوئی ہو گی تو میری ماں نہ جانے کیا سوچ کر مجھے اپنے ساتھ بابو کے یہاں لے جانے لگی تھی ___، بابو اور ان کی بیوی دونوں مجھے

بہت جلد ماننے چاہنے لگے تھے، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ایشور نے انھیں اپنا کوئی بچہ نہیں دیا تھا، اور اپنے دلوں میں چھپا ہوا بچے کا پیار انھوں نے پوری طرح مجھے بخش دیا تھا ۔۔۔۔ مالکن مجھے بھر پیٹ جو بھی ان کے یہاں بنتا تھا، کھلاتی تھی، پھر بابو کی خواہش کے مطابق میں ان سے پڑھنے بھی لگی تھی، لیکن بچپن سے لڑھکا ہوا میرا من پڑھنے میں لگتا ہی نہیں تھا ۔۔ بابو نے پہلے مجھے سختی سے سمجھانے کی کوشش کی پر جب وہ اپنے عمل میں بری طرح پٹ گیا تو اس نے اپنا طریقہ بدل دیا ۔۔ اب وہ روز میرے لیے کبھی ٹافیاں، کبھی کھلونا اور کبھی مٹھائیاں لانے لگا ۔۔۔ اور وہ سب پانے کی لالچ میں پڑھنے کی طرف میرا من لگ گیا ۔۔ میں نے باپ کا پیار نہیں پایا تھا، لیکن بابو کو پاکر جیسے میں نے اپنا باپ پالیا تھا ۔۔ دھیرے دھیرے گذرتے ہوئے دن کے ساتھ میں اپنے میں بدلاؤ محسوس کرنے لگی ۔۔ شرم کے احساس نے میرے دل کو چھونا شروع کردیا ۔۔ سب سے پہلے جو خیال میرے دماغ میں جاگا وہ تھا بابو کا ۔۔ اس کا جھکاؤ پہلے سے بہت زیادہ میری طرف بڑھ گیا تھا ۔۔۔ ہر روز کوئی نہ کوئی چیز چھپاکر مجھے دینے لگا تھا ۔۔ کبھی اسنو، کبھی پاؤڈر، کبھی لپ اسٹک، کبھی کچھ، کبھی کچھ، اور میں یہ ان دیکھی چیزیں پاکر خوش ہوتی رہی تھی ۔۔ پھر میری زندگی میں ایک نیا موڑ آیا ۔۔ بابو کی بیوی کے میکے میں کوئی شادی تھی، میری ماں بھی مالکن کے ساتھ مجھے چھوڑ کر جانے پر راضی ہو گئی، ماں کا یہ فیصلہ مجھے بہت برا لگا ۔۔ پر کرتی بھی کیا ۔۔ زور زور سے میں رونے لگی ۔۔"

ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا ۔۔

"بابو کو فرصت نہ مل سکی، ورنہ ہم سب ساتھ چلتے، اب بابو اکیلے یہاں رہیں گے تو انہیں ہوٹل میں کھانا پڑے گا، کیا تجھے ان کا کوئی خیال نہیں ۔۔ وہ تیرا کتنا خیال رکھتے ہیں ۔۔"

"بات سچ تھی ۔۔۔ ماں کی خواہش جان کر میں چپ ہو گئی، اور اسی دن بابو جب ان دونوں کو ٹرین میں بٹھاکر لوٹے تو ان کے ہاتھ میں کاغذ میں بندھا ہوا کچھ تھا، وہ ہنستے ہوئے میرے قریب آکر بولے ۔۔

"آج میں تیرے لیے بڑا قیمتی تحفہ لایا ہوں ۔۔" اس نے کاغذ سے سرخ ریشمی

ساڑی نکال کر اس کو پھیلایا اور میرے جسم کو اس سے ڈھانک دیا ۔ پہلی بار میں لاج سے پانی پانی ہو گئی اور میں نے اس کے اندر کے بابو کو صاف صاف دیکھ لیا ۔ سمجھ گئی کہ اس کی خواہش کیا تھی ۔ مقصد کیا تھا ۔ بھوک کیا تھی ۔ ؟ میں اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی طرح سلگ اٹھی ۔ کیوں کہ تھوڑی بہت تعلیم پا کر میں سمجھنے بوجھنے کے قابل ہو چکی تھی ۔ میں نے انتہائی ضبط سے کام لے کر اپنے اندر کی سلگی ہوئی آگ کی آنچ بابو کو لگنے نہ دیا اور بڑی ہمت جٹا کر ساڑی بابو کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ۔

" یہ ساڑی مالکن کے بدن پر اچھی لگے گی بابو ۔ میں پہنوں گی تو لوگوں کی نگاہوں سے گر جاؤں گی ۔ "

بابو میرا تیور دیکھ کر کچھ نہیں بولا ۔ اور ساڑی اپنے کمرے میں رکھ کر کام پر چلا گیا ۔ اس دن اس کی ڈیوٹی چار بجے دن سے بارہ بجے رات تک تھی ۔ میں نے سکون کی لمبی سانس لی ۔ سوچا کہ واپسی سے بہت پہلے اس کا کھانا اس کے کمرے میں رکھ کر مالکن کے کمرے میں بند ہو جاؤں گی ۔ جب بھی اس کی اس وقت کی ڈیوٹی ہوتی تھی وہ ہمیشہ دروازہ میں باہر سے تالا لگا کر جاتا تھا ۔ اس دن بھی اس نے ویسا ہی کیا تھا ۔ میں رسوئی گھر میں سبزی کاٹ رہی تھی کہ اچانک کھٹ کی آواز سن کر باہر نکل آئی ، دیکھا سامنے بابو کھڑا تھا ۔ اس نے بڑے پیار سے کہا ۔

" ساتھیوں نے زبردستی دو گھونٹ پلا دیا ۔ پی کر کام کرنا مشکل تھا ۔ سوچا کہ چلوں تجھ سے دو باتیں کروں گا ۔ "

" کیا باتیں کرو گے بابو ۔ "

" میں تجھے کیسا لگتا ہوں ۔ ؟ " ۔ بابو نے بڑا ٹیڑھا سوال کر دیا ۔

" ہمیشہ باپ نظر آئے ہو ۔ باپ کا پیار جو تم نے مجھے دیا ہے ۔ "

" میں نے تجھے ان نگاہوں سے کبھی نہیں دیکھا ہے اور جانتی ہے کہ میں تیری مالکن کے ساتھ کیوں نہیں گیا تھا ۔ ؟ "

" تم ہی نے کہا تھا بابو کہ تمہیں چھٹی نہیں ملی تھی ۔ "

"وہ تو میرا بہانہ تھا ــــ"

"تو سچ کیا تھا بابو ــــ؟"

اس کی نگاہوں میں ہوس جھلک آئی ــــ اور یکایک باز کی طرح جھپٹ کر اس نے میرے جسم کو اپنی بانہوں کے حلقے میں سمیٹ لیا ــــ تو میں نے اپنے بچاؤ میں پوری طاقت لگا کر وہ چاقو اس کے بازو میں گھونپ دیا جو پہلے سے میرے ہاتھ میں تھا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے میں پچھلا دروازہ کھول کر بھاگ کھڑی ہوئی ــــ بے تحاشہ بھاگتی رہی ــــ ڈیننگ ہال میں جب داخل ہوئی تو میری سانس بھاتی کی طرح پھول رہی تھی ــــ حلق خشک ہو کر کانٹے کی طرح چُبھ رہا تھا ــــ سب سے پہلے میں نے نل سے جی بھر کر پانی پیا، پانی کے چھینٹوں سے بار بار اپنے چہرے کو دھویا، سکون پا کر یہ خیال اُبھرا کہ بابو چالاک ہے ــــ کوئی الزام میرے سر تھوپ کر کہیں مجھے پکڑوا نہ دے ــــ لرزتی، کانپتی، ڈری، سہمی ڈیننگ ہال کے ایک کونے میں گھٹنوں پہ اپنا سر ٹیک کر بیٹھ گئی ــــ"

چند سکنڈ تک چُپ ہو کر وہ میری طرف دیکھتی رہی ــــ پھر اس نے پوچھا ــــ

"اپنی کہانی پوری سُناؤں یا ختم کر دوں ــــ؟"

اس کے کردار کی عظمت اور حوصلے کی بلندی جان کر میرا اشتیاق بہت بڑھ گیا تھا ــــ میں نے جلدی سے جواب دیا ــــ

"میں تمھاری پوری کہانی سننے کے لیے بے قرار ہوں ــــ"

وہ اپنی اُنگلیوں سے زلفوں کو سنوارتی ہوئی یوں گویا ہوئی ــــ

"اس رات کا ہر پل بچھو کی طرح ڈنک مارتا ہوا گذر گیا ــــ صُبح جب بھوک سے باؤلی ہوئی تو اس روپیے کی طاقت کا احساس ہوا جو بابو سے پا کر میں جمع کرتی رہی تھی ــــ سامنے حلوائی کی دُکان تھی، اس کا لڑکا راجو بچپن کے دنوں میں کبھی کبھی میرے ساتھ کھیلتا تھا ــــ جب بھی ملتا تھا، رُک کر ایک دو باتیں کر لیا کرتا تھا ــــ اس دن گدی پر وہی بیٹھا تھا ــــ مجھے دیکھتے ہی بولا ــــ"

"کافی دنوں سے تجھے دیکھا نہیں تھا ــــ تھی کہاں ــــ؟"

"ماں کے ساتھ ایک بابو کے یہاں کام کرتی ہوں —"
اس نے ایک پلیٹ میں کچوری جلیبی بھر کر میرے آگے رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔
" آج چار بجے ویٹنگ ہال میں رہنا — تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے —"
جلیبی کے رس سے میرا منھ بھرا تھا، لیکن مَیں نے اپنی آنکھوں کے اشارے سے اقرار کرلیا —،

جی بھر کر کھا کر جیب میں پیسہ چکانے کے لیے گدّی کے پاس رُکی، تو اس نے بڑی سادگی سے کہا —

" ابھی جا —، مَیں چار بجے لے لوں گا —"
اس کی بات سُن کر میرے دماغ میں کوئی بُرا خیال نہیں اُبھرا —، پہلے بھی جب وہ گدّی پر بیٹھا ہوا ملا تھا تو اس نے کبھی مجھ سے پیسے نہیں لیے تھے —، ممکن ہے کہ بچپن سے اس کو میری غربت کا احساس ہو یا کوئی اور وجہ تھی —، مَیں نے کبھی نہیں سوچا تھا —، دُکان سے نکل کر سڑک پر دو قدم چلی ہوں گی کہ سامنے بابو پر نظر پڑ گئی، مَیں بھاگی نہیں —، ڈری نہیں —، مجھے یقین تھا کہ میرے ساتھ اگر کچھ ہو گا تو راجو میری مدد کے لیے ضرور دوڑ پڑے گا —، بابو مجھے دیکھ کر بھی انجان بنا رکشہ پر بیٹھا میرے آگے سے چُپ چاپ گذر گیا —، میرا جی چاہا کہ کھلکھلا کر اس پر ہنس پڑوں —، وہ میرے آگے نگاہیں اُٹھانے کی ہمّت نہیں کر پایا تھا —، کتنی عجیب بات تھی —، پردہ کرتا بھی کیا —، بھانڈا پھوٹ جانے کا خوف اس کو لاحق تھا —، اس دن یہ حقیقت جان گئی کہ شرافت کا جھوٹا رُعب جمائے ہوئے درندہ صفت آدمی اندر سے کتنا کمزور ہوتا ہے۔ —، چار بجے ویٹنگ ہال میں آئی تو دیکھا کہ راجو میرا انتظار کر رہا تھا —، مَیں نے اس کے قریب ہو کر پوچھا۔
"کون سی ضروری بات ہے راجو —؟"
" مجھے —، پسند کرتی ہے تُو —؟"
مَیں جواب میں کچھ نہیں بولی، لیکن میری گردن شرم سے خود بہ خود جُھک گئی —
" میں تجھ سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں —" اس نے بڑے چاؤ سے کہا —

"تیرا باپ راضی ہوگا — ؟"

"مَیں تجھے دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا ہوں — پوچھنے پر وہ رضامند کبھی نہیں ہوگا، لیکن بیاہ ہوجانے کے بعد وہ مجبور ہو جائے گا — میں اس کا اکلوتا بیٹا ہوں —"

اور اسی رات ایک مندر میں جا کر اس نے پجاری کے سامنے میری مانگ کو سیندور سے بھر دیا — میرے لیے اس نے ساہوجی بازار کے قریب ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا تھا — میری سہاگ رات اسی میں گذری — اور اس کے بعد کے دنوں میں فرصت کے وقت میرے پاس برابر آتا رہا — مجھے اچھا کپڑا لا کر پہنایا — ہر سکھ دیا — جو اس کے بس میں تھا — مشکل سے چند مہینے گذرے ہوں گے کہ ایک دن اس کا اکھڑ باپ ہاتھ میں ڈنڈا لیے کر اچانک آدھمکا، اور کچھ بولے بغیر اس کا ڈنڈا راجو کے بدن پر تڑاتڑ برسنے لگا — جب میں نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی تو اس نے میری گردن پکڑ کر زور سے دھکا دیتے ہوئے کہا —

" بھاگ چڑیل نہیں تو دو ڈنڈا تجھ پر بھی لگا دوں گا —"

وہ مرد جو میری نگاہوں میں شیر تھا — چوہا ثابت ہوا — دُم دبائے چُپ رہا — ایک لفظ نہیں بولا کہ اس نے مجھ سے بیاہ کیا تھا — جنم جنم نبھانے کا وچن دیا تھا — مَیں فوراً تاڑ گئی، کہ وہ اپنے باپ کے خلاف سر نہیں اٹھا پائے گا — میرے آگے اس مکان سے نکل جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا — صرف روپے کی تھیلی میری کمر میں بندھی ہوئی تھی، باقی اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل پڑی — پرانا ٹھکانا ویٹنگ ہال میں جب پہنچی تو وہاں ماں کو بُرے حال میں پایا — وہ مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی —، دیر تک روتی رہی، بڑبڑاتی رہی۔

" میری بچی — میری دُلاری —"

اُس کا دُکھ دیکھ کر مَیں اپنا دُکھ بھول گئی —، وہ بھوکی تھی — بخار سے جل رہی تھی —، سب سے پہلے دودھ لا کر اس کو کھلایا، دوا لا کر کھلایا، پھر اپنا سارا حال جب اُس کو سُنا دیا تو وہ بڑی دھیمی آواز میں بولی —

" مالکن کے ساتھ واپس آنے کے دوسرے ہی دن بابو نے مجھے نوکری سے ہٹا دیا —،

اِدھر اُدھر کا کام کرتی رہی، تجھے کھوجتی رہی ــ، اب بزاش ہو چکی تھی ــ"

"مَیں نے ماں کو ڈھارس بندھائی ــ، ڈیننگ ہال میں پناہ لے کر چھوٹا موٹا دھندا کر لیتی ہوں ــ، کبھی پھل بیچتی ہوں ــ اور کبھی سبزیاں ــ، یہاں آدمی کے روپ میں گدھ رات میں منڈلانے لگتے ہیں ــ، ان سے خود کو بچائے رکھنے کے لیے یہ دودھاری چاقو خرید لیا ہے ــ"

وہ خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگی ــ، پھر یکایک اس نے سوال کر دیا ــ

"تو کوئی مُجرم نہیں ہے اور مرد کا بچّہ ہے تو ــ بول مجھ سے بیاہ کرے گا ــ؟"

سوال سن کر میرا سر گھوم گیا ــ، مَیں مجرم نہیں تھا ــ، چاہت کا جذبہ بھی میرے دل میں اُبھرا ہوا تھا ــ، لیکن جب مَیں خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے سرگرداں تھا تو اس کا ہاتھ تھامنے کی طاقت خود میں کہاں سے لاتا ــ

"بیاہ بچوں کا کھیل نہیں ــ، ذمّہ داری کا سودا ہے ــ میں کنگال ہوں ــ چاہتے ہوئے بھی تجھے اپنانے سے مجبور ہوں ــ"

اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا ــ پھٹ سے بولی ــ

"مَیں صرف تیرے بازوؤں کا ساتھ چاہتا ہوں ــ، اتنی رقم میرے پاس ہے کہ تیرا ساتھ پاکر کوئی بھی دھندا کر لوں گی اور تینوں خوشی سے جی لیں گے ــ"

"تیسرا کون ــ؟" ــ مَیں نے پوچھا ــ

وہ ایک کنارے فرش پر لیٹی ہوئی عورت کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی ــ

"میری ماں ہے ــ"

ہم دونوں ایک ساتھ اُٹھ کر اس کے پاس گئے اور میں نے اس سے کہا ــ

"مَیں تمھاری بیٹی کو اپنا بنانے کے لیے تم سے اجازت چاہتا ہوں ــ"

اس کی ماں اُٹھ کر بیٹھ گئی، اور بجھی بجھی نگاہوں سے غور سے دیکھتے ہوئے بولی ــ

"حلوائی کے چھوکرے کی طرح تم اس کو دغا تو نہ دو گے ــ؟"

"بیٹے جی تمہاری بیٹی کو اپنی زندگی سے زیادہ چاہتا رہوں گا ۔"

اس کی ماں محبت سے باؤلی ہو گئی ۔ میری پیشانی کو چوما ۔ یہ اس کی اجازت کا مہر تھا جو پیشانی پر لگ گیا ۔

اگلے دن میں نے لاجی کو اپنا جیون ساتھی بنالیا ۔ اس کے پاس لگ بھگ تین ہزار روپیے تھے ، سب سے پہلے سر چھپانے کی فکر لاحق ہوئی ۔ دو تین گھنٹے کی محنت کے بعد ہم دونوں نے ایک جھونپڑی کرایہ پر حاصل کرلی ، پھل کے بیوپار کا لاجی کو تجربہ تھا ۔ دو تین دنوں کے بعد ہماری پھلوں کی ایک دُکان گول چکّر کے قریب لگ گئی ، ہماری محنت اور لگن کی وجہ سے روز بہ روز ہماری دُکان کی بکری بڑھتی گئی ۔ نفع ہوتا گیا اور ہم دونوں مل کر چند مہینوں کے اندر اپنی زندگی کو آسودگی کی چھاؤں میں لے آئے ۔ چین سُکھ سے زندگی گذر رہی تھی کہ ایک دن بھونچال آگیا ۔ میرے بابو میری دُکان پر آگئے ، اُن کے ساتھ ایک آدمی اپنے ہاتھ میں ڈنڈا لیے تھا ۔

میں نے لاجی کی طرف دیکھا ۔ اس کی نگاہیں اس آدمی پر جمی تھیں اور اس کا چہرہ غصّہ سے تمتمایا ہوا تھا ۔

میں نے اپنے بابو کو پرنام کرتے ہوئے پوچھا ۔

"میرے بارے میں آپ کیسے جان پائے ۔ ؟"

" بیٹا ۔ دُنیا ابھی اچھے آدمیوں سے خالی نہیں ۔ میں نے تمھارا فوٹو اخبار میں چھپوایا تھا اور تمھاری خبر دینے والے میرے ساتھ ہیں ۔"

میں نے موقع کی نزاکت کو بھانپ کر اپنی زندگی میں پہلی بار بابو سے تن کر کہا ۔

"آپ کی آنکھوں کے سامنے سوتیلی ماں مجھ پر جھوٹا الزام برابر تھوپتی رہی ، لیکن آپ نے میرے لیے کچھ نہیں کیا ، وہ گالیاں دیتی تھی اور آپ چُپ رہتے تھے ۔ ایسی ذلیل زندگی سے تنگ آکر میں گھر چھوڑنے پر مجبور ہوگیا ——— اور لاجی نے پوچھے بغیر مجھ پر بھروسہ کرکے میری ویران زندگی میں بہار لادی ۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ ہمارا رشتہ قائم رہے تو لاجی

کو بہو قبول کریں ۔"

میرے بابو جذبات کی رو میں بہہ کر بلبلا اُٹھے ۔ اور ان کی آنسوؤں سے بھر گئیں ۔، ہونٹوں پر مُسکان لیے وہ آگے بڑھے اور اپنا ہاتھ لاجی کے سر پر رکھ دیا ۔ لاجی نے جُھک کر عقیدت سے ان کے چرن چھوئے ، اور پھر جب وہ کھڑی ہوئی تو اس کی نگاہوں نے اُس آدمی کو چاروں طرف ڈھونڈا لیکن وہ غائب ہو چکا تھا ۔

□□□

ٹوٹے سپنے

زمین پر پھیلی ہوئی برگد کی ایک موٹی جڑ پر وہ بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بیگ سے چھوٹا آئینہ نکالا اور آئینہ میں اس کی زلفوں کا عکس ابھر آیا ۔۔۔ اکا دکا بال سفیدی مائل ہونے لگے تھے ۔۔۔ وہ جھلاتی ہوئی بڑی ناگواری سے ایک بال کو توڑ کر ہوا میں اڑا دیا ۔۔۔ اور اس عمل نے اس کے خیال کو ماضی کی طرف موڑ دیا ۔۔۔

دس سال پہلے وہ اپنے جسم کی ساخت اور چہرے پر چھلکتے ہوئے روغن پر بڑی نازاں تھی۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ اپنا جیون ساتھی اس شخص کو قبول کرے گی جو اعلیٰ منصب پر فائز ہو، یہی وجہ تھی کہ رشتے کے جتنے پیغامات آئے اور ماں نے جب بھی رشتے کا تذکرہ اس سے کیا تھا کوئی بھی پیغام اس کے خیال کی میزان پر پورا نہیں اترا اور اس نے بڑی بے اعتنائی سے انکار کر دیا تھا ۔۔۔

کالج میں لکچرار کی حیثیت سے تقرری کے بعد جب وہ نئے ماحول میں داخل ہوئی اور وقت نے نئے لوگوں سے ملنے کا موقع عنایت کیا تب اس نے محسوس کیا کہ چند نگاہیں اس کا تعاقب کیا کرتی ہیں، ان میں پروفیسر ظفر کی نگاہیں بھی تھیں ۔۔۔ ان سے وہ جب بھی ملی ان کی زبان سے زیادہ نگاہیں بولتی تھیں ۔۔۔ وہ ذہین تھی، اس کے شعور کی اڑان تیز تھی ۔۔۔ سب کچھ سمجھ کر بھی انجان بنی رہی ۔۔۔ پھر ساتھ گذرتے ہوئے لمحات نے اس کے دماغ کو ایک مقصد سونپا اور وہ اپنے

رویّہ میں تبدیلی لے آئی ۔۔۔ اپنی مسکراہٹ کے ڈور سے پروفیسر کو لٹّو کی طرح نچانے لگی ۔ ناچتا ہوا پروفیسر ظفر اپنی عقل گنوا کر اپنی کمائی اس کے بیگ میں بھرنے لگا ۔ لیکن دونوں کے درمیان کی دوری بہ دستور قائم تھی ، ایک دن پروفیسر ظفر نے اپنے دل میں سلگتی ہوئی آگ کی لہر سے بے چین ہو کر کہا تھا ۔۔۔

" اب وقت آگیا ہے کہ ہم دونوں زندگی کے اٹوٹ رشتے میں بندھ جائیں ۔۔۔ میں تمہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتا رہا ہوں ۔۔۔ اور تمھاری ہر خواہش کو پورا کرتا رہا ہوں ۔۔۔ "

وہ بڑی بے ساختگی سے ہنسی اور پھر بڑی متانت سے بولی ۔۔۔

"تم ہوائی قلعہ تعمیر کرنے میں بڑے ماہر ہو ۔۔۔ زندگی کا قیمتی سودا تم سے طے کرنے کا خیال نہ کبھی پہلے میرے دماغ میں اُبھرا اور نہ آج ہے ۔ "

پروفیسر کا چہرہ جذبات سے تمتما گیا ، سپاٹ لہجے میں بولا تھا ۔۔۔

" کیا میری محبت تمہارے لیے صرف ایک کھلونا تھا ۔۔۔ ؟ جس سے تم کھیلتی رہیں ۔ "

" نہیں ظفر ۔۔۔ وہ اُجرت تھی ان اوقات کی جو تمہارے ساتھ گذرے تھے ۔ "

پروفیسر ظفر کا چہرہ لیکا یک سیاہی مائل ہو گیا ، غیر متوقع چوٹ بڑی گہری تھی ۔۔۔ خود کو سنبھالتے ہوئے ڈوبی آواز میں بولا ۔۔۔

" ان لوگوں کی نگاہوں میں میرا کیا مقام رہے گا ، جو ہمارے لگاؤ سے واقف ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے کے ہونے والے ہیں ۔ لیکن تم نے جس موڑ پر لاکر میرا ساتھ چھوڑ دینے کا اعلان کیا ہے ، مَیں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا ۔ "

" تم میرے خلوص کو کچھ اور سمجھ بیٹھے تو اس میں میرا کیا قصور ہے ۔۔۔ ؟ سچائی تو یہ ہے کہ میرے دل میں کوئی ایسا جذبہ اُبھرا ہی نہیں تھا ۔ "

" پتھر شبنم سے تر نہیں ہوتا ، مَیں جانتا ہوں ۔۔۔ مَیں بہت جلد اس کالج سے اپنا تبادلہ کرا لوں گا لیکن جب تک یہاں ہوں تم وعدہ کرو کہ وقتاً فوقتاً پبلک دوپل کے لیے مجھ سے پہلے کی طرح ملتی رہو گی تا کہ میرے وقار پر حرف نہ آئے ۔ "

جواب میں اس نے اپنا سر ہلا دیا تھا — اور جب تک پروفیسر ظفر کی وابستگی اس کالج سے رہی وہ اس کی خواہش کا خیال کرتی رہی تھی —

اس کی نگاہوں کے حصار سے نکل جانے کے بعد اس نے اپنی زندگی میں خلا محسوس کیا — اس کے من کی اُمنگوں کا تقاضا کچھ اور تھا —، اس کی چاہت کچھ تھی —، اور یہ پل اس کے لیے اذیت بھرا تھا —، اسی دوران وہ ایک دن کتابوں کے لیے لائبریری میں گئی، لائبریرین سجاد نے ایک نگاہِ التفات اس پر ڈالی اور بڑی رسان سے پوچھا —

"کون سی کتاب حاضر کروں — ؟"

پہلے بھی جب کبھی وہ لائبریری گئی تھی، سجاد کی آنکھوں سے دل کی آرزو کو چھلکتے ہوئے اس نے دیکھا تھا — لیکن اس نے سائل کی صدا کی طرح اس پر کبھی کوئی دھیان نہ دیا تھا، اَب وقت کروٹ لے چکا تھا —، پروفیسر ظفر کے زرسے پھیلتی ہوئی خوشبوؤں بھری رنگینیاں اُڑ چکی تھیں — اُڑتے ہوئے پرندے وقتی طور پر ٹھہراؤ کے لیے کوئی مقام چُن لیتے ہیں، پہلی بار اس نے سجاد کے لیے اپنے لبوں کے جام سے رس ٹپکایا —، ایک پرچی دیتی ہوئی بولی تھی —

"اِن کتابوں کی مجھے ضرورت ہے —"

"ابھی حاضر کرتا ہوں —"

سجاد سے کتابیں لیتی ہوئی وہ بولی تھی —

"تم شام پانچ بجے مجھ سے کادیری ریسٹورنٹ میں ملو —"

اس کی ملاقات کا یہ واضح اشارہ معنی خیز اور متوقع تھا، سجاد خوشی کے جذبے سے سرشار ہو اُٹھا —

کادیری ریسٹورنٹ کے ایک کونے میں نصف گھنٹہ تک یکسوئی سے باتیں کرنے کے بعد اس کو پورا بھروسہ ہو گیا کہ وہ پھر اپنے ویران میں بہار لے آئے گی — بار بار جس بے قراری اور والہانہ پن سے اس نے اپنے آپ پر فخر محسوس کیا تھا — چند ملاقاتوں کے بعد اس کو بڑی شدت سے احساس ہوا کہ ظفر اور سجاد میں بہت بڑا فرق تھا — تین سال کی طویل مدت سے

دوران ظفر نے کبھی اپنے وقار کو ٹھیس دینے کا رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کو ہر وقت اپنی عزت اور مقام کا خیال رہتا تھا۔ لیکن سجاد اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کو جب بھی موقع ملا اس نے پچھلے پن کے راستے کو اپنانے کی کوشش کی تھی۔ ایک دن من ہی من میں وہ جھلا اٹھی تھی۔ اس کے دماغ نے اُچھل کر اس کے دل پر پتھر مارا تھا۔ سوال کیا کہ اس کی منزل سجاد تو نہیں؟ کیا ظفر اس سے افضل نہ تھا۔؟ جسم کی گھٹتی ہوئی رعنائیوں کے متعلق، اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے بارے میں۔ گھر آئے رشتے کے پیغامات کو ٹھکرا دینے کی غلطی۔ اسے احساس ہوا، کہ وقت بھاگ رہا تھا۔ منزل نظر نہ آرہی تھی۔ سجاد کے آتے ہی ان تمام حقیقت بھری باتوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ جیون ساتھی بنانے کا خیال۔ اس روز بہت کچھ سوچتی رہی۔

اُس دن سجاد کے ساتھ وہ ایک پارک میں گئی۔ پارک کے ایک کنارے وہ دونوں مخملی گھاس میں بیٹھ گئے، دونوں کی ایک ہاتھ کی ہتھیلی گھاس پر ٹکی تھی۔ یکایک اس نے سجاد کے ہاتھوں کا دباؤ اپنی اُنگلیوں پر محسوس کیا۔ اس کے پورے جسم میں برقی لہر دوڑ گئی، لیکن وہ اَنجان بنی چُپ رہی۔ پھر سجاد نے اپنے پرس سے ایک قیمتی ہار نکالتے ہوئے کہا تھا۔

"خدا کرے یہ ہار جلد سے جلد ہمیں دائمی رشتہ عطا کرے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور سوچ کی گہرائی میں اُترتی ہوئی بولی تھی۔

"شادی جیون مرن کا بندھن ہے۔ جذبات سے اس بندھن کا کچھ نہ کچھ لگاؤ تو ضرور ہے۔ لیکن زیادہ اس کے سہارے قائم شدہ رشتے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں۔ پچھتاوے کے آنسوؤں سے چہرے تر ہوتے ہیں۔ زندگیاں تباہ ہوتی ہیں۔ اب تک ہم دونوں صحیح معنوں میں ایک دوسرے کو شاید ہی سمجھ پائے ہوں۔"

سجاد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لیکن چاہت کی آگ دل میں بھڑکی ہوئی تھی۔ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا تھا۔

"سچ بتاؤ۔ کیا اب تک تم مجھے سمجھ نہیں پائی ہو۔؟"

"جھوٹ بول کر میں تمہیں خوش فہمی میں مُبتلا کرنا نہیں چاہتی ۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی مَیں تمہیں جاننے پہچاننے اور سمجھنے کے دَور سے گذر رہی ہوں ۔ یہ دَور جب ختم ہو گا تو فیصلہ کرنے کا وقت آئے گا اور اس وقت کے آتے ہی میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گی ۔"

سجاد نے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا ۔

"دو سال سے ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں ۔ اپنی زندگی کے تمام حالات کتاب کی طرح تمہارے آگے بار بار کھول چکا ہوں ۔ پھر بھی تم مجھے جان نہیں پائی ہو ۔ بڑی حیرت کی بات ہے ۔"

پہلی بار جال کے جھیل سے پلکوں کا غلاف اٹھا کر وہ مسکراتے ہوئے بولی ۔

"دو سال کی مدت زندگی کی طویل مدت سے بہت کم ہوتی ہے ۔ اس لمبی مدت کی ڈور میں بندھنے سے پہلے ہم ایک دوسرے کے اور قریب ہو جائیں تو حرج کیا ہے ۔"

سجاد نے اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر بڑی وارفتگی سے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا تھا ۔

"کچھ پل کے لیے تمہاری باتوں نے میری جان ہی نکال دی ۔ نئی جان ڈالنے کا بے حد شکریہ ۔ مجھے یقین ہے کہ میرا پیار تمہیں میرا بن جانے پر راغب کرے گا ۔"

وقت کا اَن دیکھا پاؤں اپنا سفر پورا کر رہا تھا ۔ اس طرح ایک سال اور بھاگ گیا ۔ ایک دن سجاد نے اس سے کہا تھا ۔

"تم جان چکی ہو ، مَیں بھی لکچرر ہو چکا ہوں ۔ جوائن کرنے سے پہلے چاہتا ہوں کہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنا کر اپنے دل کی تڑپ مٹا دوں ۔"

اس نے فوراً سپاٹ لہجے میں جواب دیا تھا ۔

"ابھی میں تمہارے حق میں فیصلہ نہیں کر پائی ہوں ۔"

سجاد کا چہرہ غصّہ سے یکایک تمتمایا اور وہ جھلاتا ہوا اس کے پاس سے اُٹھ کر چلا گیا ۔ کئی دنوں بعد ایک روز کالج کے سائبان پر اس کی نظر سجاد پر پڑی تھی ۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس کی

طرف لپکی تھی، لیکن وہ اس کو نظر انداز کرکے آگے بڑھ گیا، سجاد کے نظر انداز کیے جانے پر وہ سوچتی رہی، اور اپنی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے پر مجبور بھی ہوئی تھی اور ہر بار اس کے دماغ نے اس کو مجرم ٹھہرایا تھا ـــ لیکن اس کے پرواز کی پرواز پہلے کی طرح رفعتوں کو چھوئے ہوئے تھی ـــ

اس دن تنہائی میں اس کی ماں نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا ـــ

"اب بھی سپنوں کی دُنیا سے نکل آؤ بیٹی ـــ ہمارے پاس اس کھنڈر نما مکان کے علاوہ ہے کیا ـــ ؟ نہ کوئی جائداد ہے اور نہ ہماری معاشی حالت ڈھکی چھپی ہے ـــ اونچے لوگ اپنی برابری کا رشتہ تلاش کرتے ہیں ـــ پھر تم کیوں خود کو امید کے جال میں پھنسائے ہوئے ہو ـ ؟ اپنے بوڑھے ماں باپ کے متعلق بھی سوچو ـــ ہم پر کیا گذر رہی ہے ـــ اب تو ہم پاس پڑوس کے لوگوں سے بھی آنکھیں چرانے لگے ہیں ـ کیونکہ ان میں چند نادان سمجھتے ہیں کہ ہم تمھاری کمائی کھانے کے لیے شادی میں رکاوٹ بنے ہیں ـ" ــــــ اور اس نے جواب دیا ـــ

"فضول باتیں نہ آپ سوچیں اور نہ اس پر دھیان دیا کریں ـــ"

اس کے ماں باپ دونوں اس کی شادی کا انتظار کرتے کرتے چل بسے تھے، وہ اس کھنڈر نما مکان میں ایک بوڑھی خادمہ کے ساتھ رہنے لگی تھی ـــ کالج سے آنے کے بعد گھر میں وقت کا گذرتا ہوا ہر لمحہ کانٹے کی طرح چبھنے لگا تھا ـ جب بھی کوئی بزرگ رشتے دار عورت اس سے ملنے آتی تھیں، ایک خیال اس کے دماغ میں جاگتا تھا ـ رشتے کے پیغام کا خیال ـــ !

برگد کی جڑ پر بیٹھی سوچتے سوچتے اس کا دماغ تھک گیا تھا ـــ حالات سے سمجھوتہ کرلینے کا اس نے فیصلہ کرلیا ـــ سجّاد بُرا نہ تھا ـــ اسی وقت سجّاد اس کی نگاہوں کے دائرے میں آگیا، بے قراری سے وہ اُٹھی، سجّاد کی طرف بڑھی، سوچا کہ اس سے صاف کہہ دے گی کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کرچکی ہے ـــ لیکن ـــ اس کی گویائی سے پہلے سجّاد نے ایک کارڈ دیتے ہوئے کہا تھا ـــ

"میری شادی کا یہ نوید نامہ ہے ـــ تم ضرور شریک ہونا ـــ"

اسی وقت برگد کی ڈالی سے ایک زرد پتہ ٹوٹ کر اس کے ہاتھوں پر آگرا ـــ آنکھوں سے اشک کے چند قطرے ٹپکے اور رخسار پر بکھر گئے ـــ

□□□

پرکھ

سیٹھ کیلاش ناتھ کے پاس مالک کا دیا سب کچھ تھا ___ کروڑوں کی دولت، بنگلہ، کاریں، فیکٹری، تین بیٹے، تین بہوئیں، دو پوتے ___ جو انھیں اتنا پیار کرتے تھے، اتنا چاہتے تھے کہ کبھی کبھی کیلاش ناتھ کو بھی اپنی تقدیر پر یقین نہیں آتا تھا ___ وہ ہمیشہ تنہائیوں میں اپنی سورگ واسی پتنی سے کہا کرتے تھے ___

"بھگوان کے بعد میں تمھارا احسان مند ہوں الکا، جو مجھے تم نے اتنے لائق اور فائق بیٹے دیئے ___"

ہر صبح چھوٹی بہو کی آواز پر ان کی آنکھیں کھُلتیں ___

"اُٹھیے بابوجی، چائے آگئی ___" چھوٹی بہو چائے کا ٹرے رکھتے ہوئے چائے بنانے لگیں ___

"ارے بہو" ___ سیٹھ کیلاش ناتھ اُٹھ کر تکیے کا سہارا لیتے ہوئے بولے ___ "گھر میں اتنے نوکر چاکر ہیں، پھر تم کیوں تکلیف کرتی ہو ___؟"

"ڈیڈی" ___ چھوٹی بہو جذباتی لہجے میں بولی ___ "یہ ادھیکار مجھ سے مت چھینیے۔"

"بہو ___ تم یقیناً لاکھوں میں ایک ہو ___"

"میں نے شکر کی ایک ہی ڈلی ڈالی ہے"۔ بہو بولی ۔ "دوسری ڈلی مت ڈال دیجیے گا۔ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے ۔"

"اچھا بابا۔ اب تو جا اور مُنّے کو تیار کر دے ۔ سیر کو جانا ہے"۔ سیٹھ کیلاش ناتھ نے کہا، اور بہو کے جاتے ہی شکر کی ایک اور ڈلی چائے میں ڈال لی ۔

مُنّے کی اُنگلی پکڑے وہ باغ میں پہنچے تو ان کے بچپن کا دوست صابر اپنے پوتے کی انگلی پکڑے کہہ اٹھا ۔ "بھئی آج تم نے دیر کر دی ۔"

"نہیں تو ؟"۔ وہ صابر کے قریب بنچ پر بیٹھتے ہوئے بولے ۔ "لگتا ہے تم ہی آج وقت سے پہلے آ گئے ہو ۔"

"ہو سکتا ہے"۔ صابر نے کہا ۔ "اور سُناؤ، سب ٹھیک ہے نا ۔ ؟"

"ہاں یار، مجھ جیسا خوش قسمت شاید ہی کوئی اس دُنیا میں اور ہو ۔ کتنا پیار کرتے ہیں میرے بچے مجھ سے ۔ ؟"

"کوئی شک نہیں کیشو"۔ صابر کے لہجے میں درد پنہاں تھا۔ "اُوپر والا کم لوگوں کو ایسی تقدیر لکھتا ہے ۔"

"اور اپنی سُناؤ"۔ سیٹھ کیلاش ناتھ نے پوچھا۔ "کیسی گذر رہی ہے ؟"

"کیا سُناؤں ۔ ؟"۔ صابر نے کہا ۔ زندگی ایک محور پر گھومتی چلی جا رہی ہے ۔"

سیٹھ کیلاش ناتھ نے ایک پل اس کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کے پھیلے ہوئے تأثرات کو پڑھ لیتا صابر بول پڑا ۔

"اچھا، مَیں چلتا ہوں ۔"

"بیٹھ یار ۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے ۔ ؟"

"نہیں دوست"۔ صابر بولا ۔ "گیارہ بجے ریاض میاں اپنی فیکٹری جاتے ہیں اور بہو نے سبزیاں لانے کی ذمہ داری مجھے سونپ رکھی ہے ۔"

"کمال ہے"۔ سیٹھ کیلاش ناتھ کے لہجے میں تعجب تھا ۔ "گھر میں ملازموں کی کمی

تو نہیں پھر تجھے سبزیاں لانے کی کیا ضرورت ؟ — نوکر چاکر، دولت، سب ریاض کا ہے جو
تیرے خون کی بوند سے وجود میں آیا ہے —"

"وہ سب درست ہے کیشو — پر ایک باپ ہونے کے ناطے تو سزا بھگتنی ہی پڑے گی -"
یہ کہہ کر صابر اپنے پوتے کی انگلی پکڑ کر باغ سے نکل گیا اور سیٹھ کیلاش ناتھ دور جاتے ہوئے صابر کو
دیکھتا رہا —

اس رات سیٹھ کیلاش ناتھ کلب سے دیر سے لَوٹے تو سب کے سب اس کا انتظار کر رہے
تھے —

"بھئی، ذرا دیر ہوگئی" — وہ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے بولے — "پر کتنی بار تم لوگوں
سے کہہ چکا ہوں کہ تم لوگ کھانا کھا لیا کرو —"

"کمال کرتے ہیں بابوجی" — بڑی بہو نے بڑھ کر ٹائی لے لی — "ہم آپ کے بغیر کیسے
کھا سکتے ہیں — ؟"

اسی بیچ بڑے بیٹے نے کوٹ لیتے ہوئے کہا — "آپ فریش ہو لیجیے — ہم سب
ڈائننگ ٹیبل پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں —"

سیٹھ کیلاش ناتھ اندر چلے گئے —

ڈائننگ ٹیبل پر بڑی بہو نے میتھی کے ساگ کے سوپ کا پیالہ سیٹھ کیلاش ناتھ کی طرف
بڑھاتے ہوئے کہا —

"لیجیے بابوجی، میتھی کے ساگ کا سوپ آپ بہت پسند کرتے ہیں نا — مَیں نے اپنے
ہاتھوں سے بنایا ہے —"

"واہ — واہ — لاؤ —"

میتھی کے ساگ کے سوپ کا پیالہ وہ بڑی بہو کے ہاتھوں سے لے ہی رہے تھے کہ چھوٹی
بہو ایک دم پیالہ ان کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی —

"یہ پالک پنیر ہے بابوجی، یہ میں نے آپ کے لیے بنایا ہے —"

"ہاں۔ ہاں۔ لاؤ۔"

وہ پیالے سے پالک پنیر لگاتے ہوئے بولے۔ "کون کہتا ہے کہ مرنے کے بعد سورگ ملتا ہے؟۔ مجھے تو جیتے جی ہی مل گیا ہے۔"

صابر، آلو کی بھاجی اور سادہ روٹی کی پلیٹ سامنے رکھتے ہوئی اپنی بہو سے بول پڑا۔
"بہو، مجھے تو مرغی کے گوشت کی خوشبو آرہی تھی۔"
"چھوٹا سا چوزا بنایا تھا، آپ کے بیٹے کے لیے"۔ بہو کے الفاظ میں زہر گھلا ہوا تھا۔
"ارے بھئی"۔ نوالہ اٹھاتے ہوئے صابر نے کہا۔ "بڑی مرغی بنا لیتیں۔ سب کھا لیتے۔"
"آپ بھی بچوں کی طرح باتیں کرتے ہیں ابّو۔ اب جو بھی ہے کھا لیجیے۔"
صابر خاموش ہوگیا، لیکن نوالے اب اس کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہے تھے۔
اگلی صبح جب صابر، سیٹھ کیلاش ناتھ سے اسی باغ میں ملا تو بولا۔
"یار کیشو، آج جانے کیوں ایک خواہش دل میں ابھر رہی ہے۔"
سیٹھ کیلاش ناتھ اس کو دیکھنے لگا۔
تھوڑی ہی دیر میں صابر چائے کی دو پیالیاں لیے آگیا۔
"لے چائے پی۔"
"لیکن تم ابھی کسی خواہش کے بارے میں کہہ رہے تھے"۔ سیٹھ کیلاش ناتھ چائے کی پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔
"یہی تو وہ خواہش تھی"۔ صابر چائے کی چسکی لیتا ہوا بولا۔ "یاد ہے، کبھی کالج کے دنوں میں ہم دونوں اکٹھے ہی چائے پیا کرتے تھے، کئی دنوں سے سوچ رہا تھا، لیکن جیب میں پیسے ہی نہیں ہوتے تھے۔ کل سبزیوں سے دو روپے بچ گئے تھے۔"
سیٹھ کیلاش ناتھ عجیب نگاہوں سے صابر کو دیکھتا رہ گیا۔

صابر اُٹھا اور چائے کی پیالیاں دینے چلا گیا۔۔ گھر لوٹتے وقت سیٹھ کیلاش ناتھ صابر کی بے بسی اور لاچاری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔۔ وہ گھر پہنچا تو فیملی ڈاکٹر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب"۔ سیٹھ کیلاش ناتھ کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔۔ "بھئی، میں بھلا چنگا ہوں اس میں چیک اپ کی کیا ضرورت ہے۔۔؟

"نہیں بابوجی"۔۔ منجھلا بیٹا بات کاٹ کر بولا۔۔ "ڈاکٹر صاحب، آپ بابوجی کی جانچ کیجیے۔"

"اب بچے کہہ رہے ہیں تو مان جائیے سیٹھ کیلاش ناتھ"۔ ڈاکٹر بولا۔۔ "اندر چلیے۔۔"

اور سیٹھ کیلاش ناتھ مسکراتے ہوئے ڈاکٹر کے ساتھ اندر چلے گئے۔۔

"سبزی سے جو دو روپیے بچے تھے ابّو، آپ نے واپس نہیں کیے"۔ بہو کی آواز تیر کی طرح صابر کے سینے کو چھید گئی۔۔

"وہ کیا تھا"۔ صابر نے اپنے سینے کے اندر کے کرب کو چھپاتے ہوئے کہا۔۔۔ "بچپن کا ایک دوست مل گیا تھا، اسے چائے پلا دی۔۔"

"کمال کر دیا آپ نے۔۔؟"

"دو روپیے سے اس گھر میں کوئی کمی تو نہیں ہو جائے گی۔۔"

"آپ کی آنکھوں میں تو اس گھر کی دولت چُبھتی ہے۔۔"

وہ بہو کے الفاظ کے تیکھے پن کو پی گیا۔۔

دوسری صبح باغ میں سیٹھ کیلاش ناتھ نوٹوں کی گڈی صابر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔۔ "لے صابر، اسے رکھ لے۔۔"

"پگلا"۔۔ صابر بولا۔۔ "بات روپیوں کی نہیں کیشو۔۔، انسانی رشتوں کی ہے۔۔، خون کے رنگ کی ہے۔۔، فرائض کے، اور اصولوں کی ہے۔۔، آج کی دُنیا میں رشتوں کا محل دولت کی اینٹوں پر کھڑا ہے۔۔، ہر رشتے مادّی حیثیت کی میزان پر تولے جاتے ہیں۔۔"

سیٹھ کیلاش ناتھ اس کی باتوں کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔۔

"ایک زمانہ تھا جب رشتوں کی پاکیزگی تھی ۔ اس کا اپنا ایک مستحکم وجود تھا ۔" صابر نے کہا۔ "لیکن آج تمام رشتے اپنا وجود کھو چکے ہیں ۔"

"میں نہیں مانتا ۔" سیٹھ کیلاش ناتھ بول پڑا ۔

"مت مان" ۔ صابر نے کہا ۔ "تیرے ماننے نہ ماننے سے سچائی تھوڑے ہی بدل جائے گی ۔"

"اچھا، میں چلتا ہوں" ۔ اور صابر چلا گیا ۔

سیٹھ کیلاش ناتھ جب اپنے سونے کے کمرے میں پہنچا تو دیر تک صابر کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتی رہی تھیں ۔ پھر وہ اٹھا اور فون کا کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا ۔

اگلی صبح جب چھوٹی بہو چائے کا ٹرے اور اخبار لے کر آئی تو اخبار کے پہلے صفحے پر ایک اشتہار تھا جس میں افریقہ کے کسی سونے کی کان کی حصہ داری کی خرید کے لیے شرائط تھیں ۔ سیٹھ کیلاش ناتھ غور سے اشتہار کو پڑھ رہا تھا ۔ اور اسی رات ڈائننگ ٹیبل پر کیلاش ناتھ نے سب سے کہا ۔

"تم سب امیر تو تھے ہی ، لیکن اب امیر ترین ہو جاؤ گے ۔"

"سمجھا نہیں کچھ بابو جی" ۔ بڑا بیٹا سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا ۔

"ارے آج کا اخبار کیا تم نے نہیں پڑھا ۔ ؟" سیٹھ کیلاش ناتھ نے کہا ۔ "افریقہ میں ایک نئی سونے کی کان نکلی ہے ، اور اس سے پہلے کہ کوئی زیادہ حصہ خریدے ، میں نے اپنی تمام جائداد بیچ کر اس کے کئی حصے خرید لیے ہیں ۔" سبھی لوگوں کی نگاہیں ان کے چہرے پر جم گئیں ۔

"مہینہ کے اندر اس کی کھدائی شروع ہو جائے گی اور سارا گھر سونے سے بھر جائے گا ۔"

اُس رات ان کے بچوں کی نیندیں اُڑ گئیں ، لیکن سیٹھ کیلاش ناتھ روز کی طرح سوتا رہا ۔

ایک مہینہ سیٹھ کیلاش ناتھ کے گھر کے سارے لوگ بے چین رہے ۔ کسی کے معمول میں کوئی فرق تو نہیں آیا ، لیکن ہر شخص کے چہرے پر تناؤ ضرور تھا ۔

اس شام جب سیٹھ کیلاش ناتھ تھکا ہارا ، نڈھال قدموں سے چلتا ہوا ہال میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھا تو سب کے سب بے چین ہو گئے ۔

"کیا ہوا بابُو جی ۔۔۔؟" بڑا بیٹا پوچھ بیٹھا ۔۔
"سب کچھ ختم ہو گیا بیٹے" ۔ سیٹھ کیلاش ناتھ سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولے ۔۔۔
"تم لوگوں کے تو اپنے کاروبار عروج پر ہیں ۔ پھر فکر کس بات کی ؟"
"وہ تو ہے بابو جی ۔۔ لیکن ۔۔؟"
"کچھ نہیں ۔۔" وہ اٹھتا ہوا بولا ۔۔ "چھوٹی بہو ۔ کھانا لگاؤ ۔۔"
ڈرائننگ ٹیبل پر سب خاموش تھے ۔۔ ہر کوئی اپنے آپ سے ہی کچھ پوچھ رہا تھا ۔۔
دوسری صبح جب چھوٹی بہو چائے کا ٹرے رکھ کر جانے لگی تو سیٹھ کیلاش ناتھ نے کہا ۔۔۔
"بہو، مُنّے کو تیار کر دیا ۔۔؟ سیر کا وقت ہو رہا ہے ۔۔"
"ڈیڈی ۔۔، رات کو وہ دیر سے سویا ہے ۔۔ آپ اکیلے ہی سیر کر آیئے ۔۔"
بہو چلی گئی، سیٹھ کیلاش ناتھ نے سوچا کہ پیالی میں شکر کی ایک ہی ڈالی جائے ۔۔
اس صبح باغ میں بنچ پر اداس بیٹھے ہوئے سیٹھ کیلاش ناتھ سے صابر پوچھ بیٹھا ۔ "تم نے جیتے جی سوَرگ پا لیا ہے ۔۔ پھر سوچ کیا رہے ہو ۔۔؟"
"سچ ایک ایسا پہاڑ ہے دوست، جسے جھوٹ کے کالے بادل ڈھک تو لیتے ہیں ۔۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک نہیں رہتے، چھَٹ جاتے ہیں، اور پھر سچ کا پہاڑ اپنے پورے وجود کے ساتھ سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے ۔۔"
اس رات سیٹھ کیلاش ناتھ جب کلب سے لوٹا تو ہال میں سنّاٹا تھا ۔۔ "ارے ۔۔ کہاں گئے سب کے سب ۔۔؟" وہ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتا ہوا بولا ۔۔
"سب اپنے اپنے کمرے میں کھا کر سونے چلے گئے بڑے سرکار" ۔ لاجی قریب آکر بولی ۔
"اوہ ۔۔۔"
"کھانا لگا دوں بڑے سرکار ۔۔؟" لاجی نے پوچھا ۔۔
"نہیں ۔۔ میں کھا کر آیا ہوں ۔۔"
اگلی صبح ڈائننگ ٹیبل پہ ان کے بڑے بیٹے نے کہا ۔۔ "بابو جی ۔ ہم لوگوں نے اپنے

نئے بنگلے میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے ۔۔، وہ فیکٹری سے قریب بھی ہے ۔۔"

سیٹھ کیلاش ناتھ نے سبھوں کی طرف دیکھا ۔۔ سب کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں ۔۔ جیسے بڑے بیٹے کے فیصلے کی تائید کر رہی ہوں ۔۔

" لیکن میں کہاں رہوں گا بیٹے ۔۔؟ "

" اسی مکان میں " ۔ بڑے بیٹے نے کہا ۔۔ " لاجی اور رام لال آپ کا ہر طرح خیال رکھیں گے ۔"

" اور تم سبھوں کا پیار ۔۔ ؟ " سیٹھ کیلاش ناتھ نے کہا ۔۔ " کیا میں اس کے بغیر جی سکوں گا ۔۔؟ "

" اس کے ذمہ دار آپ ہیں بابو جی ۔ آپ ۔ " چھوٹا بیٹا بول بیٹھا ۔۔ " ساری دولت 'جائداد گنوا بیٹھے ۔۔ "

" لیکن اپنے آپ کو تو نہیں گنوایا ، میں تو وہی ہوں بیٹے جس کے لیے تم سب ہر وقت پیچھے لگے رہتے تھے " ۔۔۔ کسی نے کچھ جواب نہیں دیا ۔۔۔

دوسری رات جب سیٹھ کیلاش ناتھ حسب معمول کلب سے لوٹا تو معلوم ہوا کہ سب کے سب نیے بنگلے میں منتقل ہو چکے ہیں ۔ سیٹھ کیلاش ناتھ بوجھل قدموں سے ہال میں گیا اور اس کی متلاشی نگاہوں نے تمام افراد کو دیکھنا چاہا ۔۔ لیکن وہاں صرف ایک بولتی خاموشی چھائی ہوئی تھی ۔۔

اگلے دن صابر سیٹھ کیلاش ناتھ سے پوچھا ۔۔ " کیا تم ان لوگوں کے بغیر جی سکو گے ۔؟ "

" میں تو جی داب کر جی لوں گا صابر ۔۔ لیکن وہ سب اس دولت کے بغیر جی نہیں سکیں گے ۔"

سیٹھ کیلاش ناتھ بولا ۔۔ " وہ ساری دولت جسے میں نے گنوا دیا ہے ، انھیں لوٹا کر دور اس رشتے کی تلاش میں نکل جاؤں گا جس کی بنیاد دولت اور حیثیت پر نہ ہو ۔۔۔۔۔ "

□□□

چہرے

صاعقہ رکشہ سے کود کر بے تحاشہ بھاگی ــــ گذرتے ہوئے جلوس پر پتھراؤ ہوا ــــ بھگدڑ مچی ــــ یکایک اشتعال انگیز نعروں نے فضا میں نفرت کا زہر بھر دیا ــــ جنون کا دھواں اُٹھا ــــ اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی صدیوں پرانی قدریں اس دُھوئیں میں ڈھکنے لگیں ــــ بھاگتی ہوئی صاعقہ کا دوپٹہ کہیں اُڑا ــــ کتابیں کہیں گریں ــــ سراسیمگی کی حالت میں اور چھور ــــ بھول بھال کر گرتی پڑتی ــــ جان بچانے کی خاطر کچھ جانے بنا ایک مکان میں گھس پڑی ــــ اور دروازہ بند کرتے ہی اس کے ہوش نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ــــ چہرے پر پڑنے والے پانی کے چھینٹوں کی ٹھنڈک سے چونک کر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی خوف زدہ سہمی ہوئی آنکھوں کے سامنے نصف صدی کا سفر طے کیا ہوا آدمی اپنی پیشانی پر ترشول دھاری اور اس کے اوپر سُرخ ٹِکا لگائے کھڑا تھا ــــ

صاعقہ کانپتی تھرتھراتی رہی ــــ لیکن اس کے ہونٹوں سے کوئی بات نکل نہیں پا رہی تھی ــــ،

وہ آدمی صاعقہ پر اپنی نگاہیں جمائے ہوئے تھا ــــ

صاعقہ لرزتی ہوئی گِھگھیائی ــــ

"م، م، مت، م، م، مارو ــــ م، م، مجھے زندہ رہنے د، د، دو ــــ"

وہ آدمی سکوت توڑ کر بڑے ٹھہراؤ بھرے لہجے میں بولا ــــ

"میں تمھیں درندہ دکھائی دیتا ہوں ۔۔۔؟" اس آدمی کا چہرہ دل کے بہاؤ سے تن گیا ۔۔

"ڈرو نہیں ۔۔۔، ابھی دھرتی انسانوں سے خالی نہیں ہوئی ہے ۔۔۔"

صاعقہ کی آنکھیں حیران ہوتی رہیں ۔۔۔، اس کا وجود خوف کے الاؤ میں جلتا رہا ۔۔۔، ہونٹ پھڑپھڑائے ۔۔۔، لیکن زبان اب بھی نہیں بول پا رہی تھی ۔۔۔

"یہ گھر تمھارا ہے اور یہاں تمھاری جان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی ۔۔۔، سامنے والی کوٹھری میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لو ۔۔۔، خبردار کسی طرح کی آواز نکلنے نہ پائے ۔۔۔، باہر سے میں تالا لگا دوں گا ۔۔۔، لیکن یاد رہے، میرے حکم کے بغیر دروازہ مت کھولنا ۔۔۔"

نجات کا کوئی راستہ نہ پا کر صاعقہ لڑکھڑائی چپ چپ اٹھی اور کوٹھری میں بند ہو کر چوکھٹ سے لگ کر بیٹھ گئی، گولیاں چلنے اور بموں کے پھٹنے کی آوازیں رہ رہ کر فضاؤں میں گونج رہی تھیں ۔۔۔، وہ اپنی زندگی خاطر ۔۔۔، عادت کے خلاف چپ سادھ کر وقت کی دی ہوئی سزا کاٹنے لگی ۔۔۔، عورت ہونے کی بنا پر یہ سزا بڑی سخت تھی ۔۔۔، کہتے ہیں کہ ایک شوہر نے اپنی بیوی کی چلتی ہوئی زبان سے تنگ آکر اس سے کہا تھا کہ اگر وہ اس کے گھر میں قیام کے دوران اپنی زبان چلانے سے گریز کیا کرے تو وہ ہر ماہ کے اختتام پر اس کو ایک زیور دیا کرے گا ۔۔۔، جواب میں بیوی تن کر اپنے شوہر سے برجستہ بولی تھی ۔۔۔، بھاڑ میں جائے تمھارا زیور ۔۔۔، جب میں زندہ ہی نہ رہوں گی تو وہ پہنے گا کون؟ ۔۔۔ تو صاعقہ بھی عورت تھی ۔۔۔ زبان چلانے کا مرض اس کو بھی لاحق تھا ۔۔۔، دُنیا کی تمام عورتوں کی طرح وہ بھی اپنی زبان سے ڈھال اور تلوار کا کام لیتی تھی ۔۔۔

کوٹھری کے اندھیرے میں کواڑ کی دراڑ سے آتی ہوئی روشنی نے اس کے ذہن کو اپنی طرف موڑا ۔۔۔، دراڑ پر اپنی ایک آنکھ جما کر وہ باہر جھانکنے لگی ۔۔۔

وہ آدمی باہر ہی دروازہ کے سامنے کھٹیا پر لیٹا تھا اور کھٹیا سے دو ہاتھ کی دوری پر لالٹین جل رہی تھی، سکون کی لمبی سانس لیتی ہوئی اس نے اپنی گردن اٹھائی ۔۔۔ گذرتا ہوا ہر پل موت بن کر اس کی زندگی کی چاہتوں میں جکڑی ہوئی بے بس بیٹھی تھی ۔۔۔، خوف سے بلبلا کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، سوچ کی لہروں میں بہتے ہی اس کی بند آنکھوں میں ماں کا حسین پیکر اُبھرا اور احساسِ ندامت سے اس نے

سر جھکالیا۔۔۔ ماں کا حکم مان کر وہ ٹیوشن پڑھنے نکلی نہیں ہوتی تو اس طرح موت کے پھندے میں نہیں پھنستی ۔۔۔ کتنے ارمانوں سے وہ اس کے بیاہ کا جوڑا بنوا رہی تھیں ۔۔۔ آئے دن وہ ساڑیوں میں سلمیٰ ستارے خود ٹانکتی رہتی تھیں ۔۔۔ پھوٹا نصیب اس کا وہ دن اب اس کی زندگی میں آنے نہ دے گا۔

باہری دروازہ کوئی ہلکے ہلکے تھپ تھپانے لگا ۔۔۔

صاعقہ چونکتی ہوئی گھبرا کر دراڑ سے جھانکنے لگی ۔۔۔

"کون ۔۔۔؟" بابا نے پوچھا ۔۔۔

"میں، راگھو ہوں بابا ۔۔۔" آواز آئی ۔۔۔

"کس لیے آئے ہو ۔۔۔؟" بابا کی کرخت آواز اُبھری ۔۔۔

"کواڑ کھولیے پہلے ۔۔۔" آواز آئی ۔۔۔

بابا نے دروازہ کھول دیا ۔۔۔

دو آدمی اندر آ گئے ۔۔۔

بابا نے جلدی سے دروازہ بند کر کے حیرت زدہ آواز میں کہا ۔۔۔

"راگھو اور رحیم دونوں ساتھ ساتھ ۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔! ہم غنڈے کہلاتے ہیں بابا ۔۔۔ ہم دونوں جگری دوست ہیں ۔۔۔ مال مُدرا کے لیے اُلٹ پھیر کا چھوٹا موٹا دھندا کر کے جیتے ہیں ۔۔۔ ذات پات، دھرم، مذہب کی باتوں کے چکر میں نہیں پھنستے ہیں ۔۔۔ کبھی ہم جھگڑتے بھی ہیں تو صرف روٹی کے بٹوارہ کے چلتے ۔۔۔ ورنہ ہم ایک ہیں، جب میں مسجد کے زینے پر رحیم کے ساتھ سوتا ہوں تو رحمان بن کر سوتا ہوں، اور جب رحیم میرے ساتھ دھرم شالہ میں ٹھہرتا ہے تو رامو بن جاتا ہے ۔۔۔" راگھو بولا ۔۔۔

"شہر کا کیا حال ہے بیٹے ۔۔۔؟"

"کیا کہوں بابا ۔۔۔ بُرا کسی کو کیا بُرا کہے ۔۔۔ لیکن ہم خونی کھیل کھیلنا نہیں جانتے ہیں ۔۔۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی ۔۔۔ پھر بابا کی آواز اُبھری ۔۔۔

"تم دونوں آئے کس لیے ہو ۔۔۔؟"

شہر میں ملٹری کے جوان سڑکوں کی ناکہ بندی کر رہے ہیں ۔۔۔ ہم اپنے تھیلوں کے ساتھ اپنے اڈوں پر جا نہیں پائیں گے ۔۔۔ رات بھر کے لیے اپنے تھیلوں کو یہاں رکھنا چاہتے ہیں ۔۔۔"

"ایک شرط ہے میری ۔۔۔"

"کیا ۔۔۔ بابا ۔۔۔ ؟"

"صبح آتے وقت ملٹری کا جو بھی افسر ملے، ساتھ لیتے آنا ۔۔۔"

"کس لیے بابا ۔۔۔ ؟" دونوں نے ایک زبان ہو کر پوچھا ۔۔۔

"مَیں نے تو نہیں پوچھا تھا کہ تم دونوں پولس کی وردیاں کہاں سے لائے ہو ۔۔۔ ؟ کیوں پہن کر آئے ہو ۔۔۔ ؟ پھر تم دونوں کیوں پوچھتے ہو ۔۔۔ ؟ بھروسہ کرو ۔۔۔ میری ذات سے کسی کا کبھی نقصان پہنچا ہے ۔۔۔ اور نہ پہنچے گا ۔۔۔"

دونوں لاجواب ہو کر تھیلوں کو مکان کے ایک کونا میں رکھ کر چلے گئے، اور بابا دروازہ بند کر کے کھٹیا پر لیٹ گیا ۔۔۔

صاعقہ نے اپنی گردن اٹھائی اور دیوار سے ٹیک کر بیٹھ گئی ۔۔۔ لمحہ لمحہ بڑھتی ہوئی بیقراری میں کبھی اس نے پاؤں پھیلائے، کبھی ٹخنوں پر اپنے سر کو ڈالا ۔۔۔ صدیوں کی طرح رات گذرتی رہی۔

صبح کا اجالا جب روشن دان سے کوٹھری میں اترا تو اسی وقت باہری دروازہ پر ہلکی ہلکی دستک ہوئی ۔۔۔ صاعقہ جھانکنے لگی ۔۔۔

"کون ہو بھائی ۔۔۔ ؟" بابا نے پوچھا ۔۔۔

"مَیں ۔۔۔ راگھو ۔۔۔ اپنے ساتھ صاحب کو لایا ہوں ۔۔۔"

بابا نے جھٹ دروازہ کھول دیا ۔۔۔

ملٹری کے جوانوں کے ساتھ ان کا افسر اور راگھو اندر آ گئے ۔۔۔

جوانوں کے ہاتھوں میں مشین گنیں تنی تھیں، افسر کے ہاتھ میں ریوالور تھا ۔۔۔ اس نے بابا سے پوچھا ۔۔۔ "کیا بات ہے ۔۔۔ ؟ کیوں بلایا ہے ۔۔۔ ؟"

"ایک لڑکی کو مَیں آپ کی مدد سے اس کے گھر پہنچانا چاہتا ہوں ۔۔۔"

"کہاں ہے وہ لڑکی ـــ؟"

بابا تیزی سے اس کوٹھڑی کے پاس آیا جس کے اندر صاعقہ بند تھی ـــ تالا کھولتا ہوا تیز آواز میں بولا ـــ "نکل آؤ بیٹی ـــ کوئی خطرہ نہیں ہے ـــ"

صاعقہ نکل آئی ـــ پھر وہ اور بابا دونوں جوانوں کے گھیرے میں نیشنل ہائی وے پر آکر ملٹری کی گاڑی میں بیٹھ گئے ـــ چلتی ہوئی گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھی صاعقہ ویران سڑکوں اور شہر کا نظارہ دیکھ کر اندر ہی اندر کپکپا گئی ـــ

ایک سڑک کے کنارے دونوں طرف کی دکانیں جلی ہوئی تھیں ـــ چند اس وقت تک جل رہی تھیں اور فائر بریگیڈ کے جوان آگ پر قابو پانے میں لگے ہوئے تھے ـــ ہر موڑ ـــ ہر چوراہے پر ملٹری کے جوان ٹولیاں بنائے چوکس کھڑے تھے ـــ گاڑی اس کے محلّہ سے کچھ فاصلے پر تھی تو صاعقہ نے دیکھا کہ مکانوں کی چھتوں پر دفاعی مورچہ سنبھالے ہوئے لوگ بھاگ دوڑ کرنے لگے تھے۔ شاید ملٹری کا افسر بھی دیکھ چکا تھا ـــ خطرے کا امکان پاکر وہ گاڑی رکوا کر نیچے اتر گیا ـــ راہِ عمل سوچ کر اس نے ایک جوان سے ہینڈ مائک لے لیا ـــ اور صاعقہ کو اترنے کا حکم دے کر مائک سے چلایا۔

"ہم آپ کے دوست ہیں ـــ دشمن نہیں ـــ کس کو لائے ہیں دیکھیے ـــ"

ردِّ عمل خاطر خواہ ہوا ـــ صاعقہ کے مکان کا دروازہ سب سے پہلے کھلا ـــ اور اس کے ابّو پاگلوں کی طرح دوڑ پڑے ـــ ملن کا لمحہ ولولہ خیز بن گیا ـــ صاعقہ خود کو سنبھالتی اپنے ابّو سے بولی۔

"بابا سے ملیے ـــ کل سے میں بابا کی پناہ میں تھی ـــ"

تشکر بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کے ابّو نے بابا کو اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا ـــ ملٹری کا افسر وقت کے تقاضوں کو سمجھ رہا تھا ـــ بابا کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا ـــ

"ہمارا ہر پل قیمتی ہے بابا ـــ"

گاڑی پر بیٹھ کر بابا نے قریب کھڑی صاعقہ کو دعا دی ـــ

"جیتی رہو ـــ اور سہاگن بنو ـــ"

صاعقہ بے اختیار ہو کر رو پڑی ـــ جھر جھر آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگا ـــ اور دور ہوتی

ہوئی گاڑی اس کی نگاہوں کی حدود سے نکل گئی ــــ

کئی دنوں تک اس شہر میں اکاد کا واردات ہوتی رہی ــ، افواہیں پھیلتی رہیں ــ لیکن مشتبہ افراد کی گرفتاریاں شروع ہوتے ہی حالات تیزی سے معمول پر آنے لگے ــ، چند باشعور شہری بھی اپنے فرائض کو سمجھ کر آگے آئے ــ اور ان کی کاوشوں سے دلوں کے درمیان کی محبت کا ٹوٹا ہوا پل سقوب پ تھاپ کر دوبارہ کھڑا کر دیا گیا ــ، پوری طرح امن بحال ہوتے ہی ایک دن طے شدہ پروگرام کے تحت صاعقہ اور اس کے ابّو، بابا سے ملنے جب اس موڑ پر آئے جہاں پارچہ فروش کی دُکان تھی اور جس کے سامنے کشادہ گلی میں بابا کا مکان تھا تو صاعقہ بابا کا جلا ہوا مکان دیکھ کر بوکھلا گئی ــــ

بے چین ہو کر اس نے دُکان دار سے پوچھا ــــ

" بابا کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہیں ــ ؟ "

دُکان دار نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا ــــ

" بابا غنڈوں کا سرغنہ تھا ــ موقع پا کر کسی نے اس کا صفایا کر دیا ــ "

صاعقہ کا سر چکرایا ــ، دل میں درد اُٹھا ــ، اور آنکھوں میں اندھیرا چھاتے ہی وہ گرتی ہوئی وہ اپنے ابّو کی باہنوں میں جھول گئی ــــ !

□□□

اَمن کا پہلا پڑاؤ

جمّوں پہنچ کر مخصوص اخبارات کے چاروں نمائندوں نے آسمان کی طرف دیکھا، تو ہلکا گلابی سا رنگ بڑی تیزی سے دائیں سمت سے پھیل رہا تھا۔ قیادت کی ڈور نیاز کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ایک ٹیکسی کے پاس پہنچ کر ڈرائیور سے بولا —

"آپ سری نگر چلیں گے —؟"

"وقت کا مُجھ کا وُ عجیب ہو گیا ہے بابو — پہلے مُسافروں کو بہ دقت تمام ٹیکسیاں ملتی تھیں، آسودگی کا دَور تھا — ہم کسی خطرے میں کودنے پر کسی اُجرت پر آمادہ نہ ہوتے تھے — لیکن اَب، پیٹ کی دہکتی ہوئی بھٹی کو ٹھنڈا رکھنے کی خاطر خطرہ کے خیال کو دماغ سے نکال چکے ہیں، ویسے آسمان کا رنگ برف باری کا اعلان کر رہا ہے" — ڈرائیور نے کہا —

"راستہ میں کوئی جائے پناہ تو مل ہی جائے گی —؟" نیاز نے سوال کیا —

"ایک سو چھپتّر کیلو میٹر کے فاصلہ پر چند ہوٹل ہیں، کہیں بھی رُک کر ہم رات گذار سکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ کوئی بِکا ہوا شر پسند ہماری راہ میں کوئی دشواری کھڑی نہ کر دے —"

چاروں ٹیکسی پر بیٹھ گئے اور دُوری طے ہونے لگی، ٹیکسی ایک سو ستّر کیلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے پٹنی ٹاپ پہنچنے ہی والی تھی کہ ابر باراں کے تیز جھونکوں سے بُودلو، چنار، سفیدا اور دیئر

کے پتّے عجیب دہشت ناک آوازیں پھیلانے لگے — اور تیز برف باری شروع ہو گئی، ڈرائیور نے تحفظ کے خیال سے ٹیکسی سڑک کے کنارے لگا دی، رفتہ رفتہ سڑک سفیدی کی چادر میں لپٹ کر دریا نظر آنے لگی، کچھ دیر تک سب خاموش بیٹھے برف باری کے رُکنے کے منتظر رہے لیکن برف باری کے ساتھ ہواؤں کا جھونکا بھی طوفان خیز ہوتا گیا — تو نیاز نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"پہلا ہوٹل یہاں سے کتنی دُوری پر ہے — ؟"

"پانچ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ٹپنی ٹاپ ہے، سوم ناتھ پٹواری کا ایک ہوٹل ہے، جب سے اس خطّہ میں بربریت پھیلی ہے، وہ ہوٹل بھی زیادہ تر بند رہتا ہے — اس کے دونوں بیٹے دہلی جا کر کوئی کام کرنے لگے ہیں، صرف سوم ناتھ پٹواری اور اس کی بیوی اس ہوٹل کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھ کر ڈٹے پڑے ہیں —" ڈرائیور نے کہا۔

"آپ وہاں تک ہمیں لے چلنے کی کوشش ضرور کریں، ورنہ ان حالات میں ہمارے حوصلے ڈوبنے لگیں گے —" نیاز کی آواز میں التجا پنہاں تھی —

ڈرائیور منجھا ہوا تھا، چیونٹی کی رفتار سے پھیلی ہوئی برف پر وہ انتہائی ہوشیاری سے اپنی ٹیکسی سرکانے لگا — کام پُرخطر تھا — ہلکی سی لغزش موت کا سبب بننے کے لیے کافی تھی۔ دس منٹ کی مسافت جب تین گھنٹہ میں پوری کر کے کار سوم ناتھ پٹواری کے ہوٹل کے سامنے لگی، تو ہوٹل کے تمام دروازے بند تھے — کار کے سائڈ گلاس کو تھوڑا سا گرا کر ڈرائیور نے زور سے ہانک لگائی —

"ارے او بھیّا — سوم ناتھ پٹواری — دروازہ ذرا کھولو —" گرتی ہوئی برف اور تیز ہواؤں کے جھونکے آواز کی سمت کو موڑ دیتے، کئی بار تیز ہانک لگانے کا امید افزا نتیجہ نہ نکلا تو نیاز نے بریف کیس سے ایک اونی کمبل نکال کر ڈرائیور کو دیتے ہوئے کہا —

"تکلیف تو آپ کو یقیناً ہو گی — لیکن ہم ٹھٹھرتے جا رہے ہیں، کہیں ہمارے جسموں میں خون منجمد نہ ہو جائے —"

ڈرائیور نے کمبل سے خود کو پوری طرح ڈھانک لیا، اور ٹیکسی سے نکل کر دروازہ کو تھپتھپانے

لگا۔ مسلسل کوششوں کے بعد بڑی دھیمی آواز اندر سے آئی ___

"کون ہو بھائی ___؟"

"میں کرتار ہوں کاکا۔ چار مُسافر بھی ہمارے ساتھ ہیں ___"

دروازہ کا پٹ نصف کھُلا ___ نیاز اپنے ساتھیوں کے ساتھ داخل ہوئے، پھر کرتار نے پلٹ کر ٹیکسی کی چابی نکالی اور تمام دروازوں کو بولٹ کر کے وہ بھی اندر داخل ہو گیا، اس وقت تک نیاز اپنے ساتھیوں کے ساتھ، بچھے ہوئے پلنگوں پر کمبلوں میں خود کو پوری طرح چھُپا کر بیٹھ چکا تھا، کرتار بھی ایک خالی پلنگ پر جب بیٹھ گیا تو اس نے ہانک لگائی ___

"قہوہ تو پلاؤ کاکا ___!"

"آج ذرا تلخ لگے گا کرتار۔ شکر کم ہے، روپیے بھتے نہیں، منگوا نہ سکا ___"

سوم ناتھ پٹواری اسٹیل کے پانچ گلاس کو ٹرے میں رکھ کر لے آیا ___ اور باری باری سب کو تھما دیا ___

اندر سے نحیف آواز آئی ___

"رات کے لیے کیا بناؤں ___؟"

"جو ہو کاکی بنا دو ___" کرتار نے تیز آواز میں جواب دیا ___

اُس وقت سوم ناتھ پٹواری بھی کمبل اوڑھ کر ایک پلنگ پر بیٹھ چکا تھا۔ درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہنے لگا ___

"بہت سال پہلے میرے پُرکھوں نے بڑی مشکل سے ایک کٹھا زمین خریدی تھی، اور اس پر ایک معمولی چائے کا اسٹال کھڑا کیا تھا، کڑی محنت سے وہ چل نکلا ___، اور کئی پیڑھیوں کے بعد جب میں اس کا مالک بنا تو اس وقت اسٹال ہوٹل بن چکا تھا ___، سہانا دور تھا ___، نہ کوئی فساد، نہ کوئی جھگڑا ___ کشمیر رنگین جنت بنا تھا۔ سیاحوں کی ریل پیل تھی ___، بیرون ممالک کے سیاح بخششوں سے جھولیاں بھر دیتے تھے ___ میں نے اسی ہوٹل کی کمائی سے سیب کے دو باغ خریدے ___ تمھاری کاکی برابر کہتی تھی کہ میں اس کا نام تاج ہوٹل رکھوں گی ___ لیکن

کرتار، چندہی سال کے اندر مفاد پرست افراد نے ہمارے سارے حسین سپنوں کو چور چور کر دیا ___، باغ ویران ہے ___، ہوٹل ویران ہے ___، اور ہمارے دلوں میں قبر کے اندر کا سا سناٹا پھیلا ہوا ہے ___، کب کوئی دہشت پسند گھس آئے گا اور ہم ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں گے ___، اسی خوف سے مَیں نے اپنے دونوں بیٹوں کو جی داب کر دلی بھیج دیا ہے، اس کی جدائی بہت کھلتی ہے ___، پر بلانے کی ہمت نہیں ___"

ٹھیک اسی وقت کوئی دروازہ زور زور سے پیٹنے لگا ___

سوم ناتھ پٹواری پلنگ سے اُٹھتا ہوا انتہائی کانپتی ہوئی آواز میں بولا ___

"جلانے اور مارنے والا اُوپر ہے ___، موت ہوگی مر جائیں گے، زندگی ہوگی کوئی مار نہیں پائے گا ___"

کواڑ کھلتے ہی تین سیاہ پوش نوجوان AK-47 رائفلیں تانے اندر داخل ہو گئے، اور ان میں سے ایک کواڑ بند کر کے پہرہ دینے لگا ___، دو نوجوان چاروں اخباری نمائندوں کی طرف رائفلوں کا رُخ کر کے آگے بڑھتے ہوئے تلخ سپاٹ لہجے میں بولے ___

"کون ہیں آپ سب ___؟"

"اخباری نمائندے ___"

"کشمیر آنے کا مقصد ___؟"

"امن کے قیام کا جائزہ لینا اور امکانات تلاش کرنا ___"

"سیاہ پوش کھلکھلا کر ہنس پڑا ___، یکایک سنجیدہ ہو کر بولا ___

"پانچ سالوں سے کشمیر جل رہا ہے ___ گاؤں سے چیخیں اُبھر کر فضا میں خون کی سُرخیاں پھیلا رہی ہیں ___، اور جب کہ یہ لوچری خانہ بن چکا ہے تو آپ حضرات امن کے امکانات ڈھونڈنے نکلے ہیں ___؟ جو قیمتی زندگیاں برباد ہوئی ہیں اس کی تلافی کرنے کا بھی کوئی ارادہ ہے ___؟"

یکایک پھر دروازہ پر دستک ہوئی ___، تینوں ٹرینڈ گوریلا جنگجو تھے، انتہائی دانائی سے ایک لمحہ کے اندر اخباری نمائندوں کے پلنگوں کے اندر گھس گئے، سوم ناتھ پٹواری نے دروازہ کھولا۔

آرمی کے چند جوان اپنے افسر کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔

"مجھے وائرلیس سے خبر ملی ہے کہ پہاڑی کے ڈھلوان سے چند سیاہ پوش سڑک پر اُترے ہیں، تیز برف باری کی وجہ سے ہماری زد سے نکل گئے۔ ہوشیار رہنا۔ اور ہاں۔ تمہاری پلنگوں پر بیٹھے یہ کون ہیں۔؟"

نیاز اور اس کے ساتھیوں نے فوراً کمبلوں سے خود کو نکال کر اپنے شناختی کارڈ، اور پروانہ راہ داری افسر کی طرف بڑھا دیئے۔ افسر دیکھ کر انھیں واپس کرتا ہوا سوم ناتھ پٹواری سے بولا۔

"چوکنا رہنا۔ تمہارے جوان سڑک پر کڑی نگاہ جمائے پہرہ دے رہے ہیں۔ جب تک تین دستک نہ ہو، دروازہ ہرگز مت کھولنا۔"

ایک معمولی لغزش کتنی اموات کا باعث بن جاتی۔ لیکن سوم ناتھ پٹواری اپنی عمر کے دامن میں سمٹا ہوا زمانہ دیکھ چکا تھا۔ دُکھ درد کے اندر پھیلی ہوئی کڑواہٹ سے پوری طرح واقف تھا۔ اپنے چہرہ پر بغیر کوئی تاثر جھلکائے چُپ کھڑا رہا۔ اور ان کے لَوٹتے ہی سوم ناتھ پٹواری نے دروازہ بند کر کے اس میں قفل لگا دیا۔ اور لَوٹنے والوں کے قدموں کی چاپوں سے پوری طرح جب مطمئن ہو گیا تو اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اَب نکل آؤ۔ بھائیو! ۔ خطرہ ٹل گیا۔"

وہ تینوں پلنگوں کے اندر سے باہر نکل آئے۔ لیکن ان کی رائفلوں کی نالیں جُھکی رہیں۔ شاید کوئی نیا جذبہ ان کے دِلوں کے کونوں میں اُبھر رہا تھا۔ رائفلوں کو زمین پر رکھ کر وہ تینوں نیاز کی پلنگ پر بیٹھ گئے اور ان میں سے ایک نے انکشاف کیا کہ آپ لوگوں کے متعلق ہمیں تفصیل سے اطلاع دی جا چکی تھی۔ اور ہم سر پر کفن باندھ کر آپ لوگوں کو اغوا کرنے کے کام پر نکلے تھے۔ اُمید تھی کہ اخبارات کے مالکان مُنھ مانگا دام پر آپ لوگوں کی رہائی چاہیں گے۔ لیکن آپ لوگوں کی اَمن کی خواہش اُبھر کر ہمارے آگے پیار کی دیوار کھڑی کر چکی ہے۔"

نیاز، اُن تینوں کے دلوں پر پیار کا نقش اُبھرا ہوا پا کر بولا۔

"مجھے چند سوال آپ سے پوچھنے کی اجازت ہے ۔۔؟"

"بھائی، اب جو چاہو پوچھو ۔۔ میں بھی کھل کر باتیں کرنے کے لیے تیار ہوں ۔۔" ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ تندرست تھا، بولا ۔۔

"بربریت کے سہارے کیا آپ اپنے مکان میں کسی دوسرے کا تسلط قبول کریں گے ۔؟"

"میں کیا ۔۔ کوئی بھی ایسا ہوتا برداشت نہیں کرے گا ۔۔"

"تو پھر کشمیر کا یہ حصہ جس ملک کے اقتدار میں ہے وہ اس حصہ سے دست بردار ہو جائیگا؟"

"یہی ۔۔ ایک اہم نکتہ ابتدائی دنوں میں ہمارے سوچنے کا تھا ۔۔ اور سچائی یہ ہے کہ بیکاری نے بھوک اور افلاس پھیلا دی تھی ۔۔ گیلے گڑ کا مٹھاس چاٹنے کی خاطر مکھیاں پھنس جاتی ہیں ۔۔ ٹھیک اسی طرح خود مختاری کی آواز اُٹھانے والے افراد حصول زر کے جنون میں مُبتلا ہوتے گئے ۔۔"

"اب جو حال ہے کس نتیجہ کے امکان کا آپ کو یقین ہے ۔؟"

"تیز نفرت بھری ہوائیں چل رہی ہیں ۔۔ کوئی بھی مفاد پرست شاطر یا زر خرید قاتل ان ہواؤں میں چنگاریاں اُچھال دے گا اور یہ گلستاں راکھ کا ڈھیر بن جائے گا ۔۔"

"آپ سب اب بھی خلوص سے چاہیں تو یہاں کی زعفران کی کھیتیاں ہیبب کے باغات، شالیمار باغ، نشاط باغ اور ڈل جھیل میں تیرتے ہوئے شکارے قائم رہ سکتے ہیں ۔۔ اس خطّہ پر تسلّط قائم ہو سکتا ہے ۔۔" نیاز نے کہا ۔۔

"وہ کس طرح ۔۔؟" مرزا نے بڑی چاہت سے پوچھا ۔۔

"ہندوستان وسیع ملک ہے، اَن گِنت سیاسی پارٹیاں ہیں، مرکز پر کسی کا اقتدار ہے ۔۔ اور صوبوں میں دوسری پارٹیوں کا ۔۔ بنگال سُرخ جھنڈوں کے اندر فروغ کی طرف گامزن ہے، تو بہار کی حکومت کی ڈور دوسری پارٹی کے محافظوں کے ہاتھوں میں ہے ۔۔ اور تمام امن وامان قائم ہے ۔۔"

"آپ کا اشارہ میں سمجھ گیا ۔۔ خود مختاری کا مطالبہ کرنے والے صاف ذہنوں کے

افراد کو یقیناً اب اپنا طریقۂ کار بدل دینا چاہیے ــــ، اور جو راہ آپ نے دکھائی ہے، گو سہل تو ہرگز نہیں، لیکن واحد راستہ اب یہی ہے کہ یہاں کی اکثریت اور اقلیت دونوں ایک جان دو قالب بن کر نئی پارٹی تشکیل دیں ــــ، اور اپنی حکومت قائم کریں ــــ" مرزا نے کہا ــــ

نیاز نے مرزا کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا ــــ

" اس اہم کام میں وقت تو لگے گا ــــ، سب سے پہلے ہم خیال لوگوں کو ایک لڑی میں پرونا ہوگا ــــ، اس کے بعد ہر گاؤں کے زرخرید قاتلوں سے پاک کرنا پڑے گا اور سرحد پر کڑی نگرانی کی ضرورت پڑے گی تاکہ بُرے عناصر پھر گاؤں کا رُخ نہ لے پائیں ــــ" نیاز نے مرزا سے کہا ــــ

" آپ کا تعاون کیا رہے گا ــــ؟"

" مَیں آپ لوگوں کے اقدام کو اخبارات کے ذرائع سے سراہوں گا اور امن داماں قائم ہونے کے بعد الکشن کا وقت آئے گا تو ہم چاروں اخباری نمائندے اپنے قلموں کے زور سے عوام کو آپ کا ہم نوا دیں گے ــــ" نیاز نے کہا ــــ

مرزا اور اس کے دونوں ساتھیوں نے نیاز کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا ــــ

" کل سے مَیں اپنے تمام ہم خیالوں سے رابطہ قائم کر کے جتن شروع کر دوں گا ــــ" پھر مرزا نے اپنی کلائی سے گھڑی اتار کر نیاز کی کلائی میں باندھتے ہوئے کہا ــــ

" اس گھڑی کو غور سے دیکھیے، اس کی چابی کے دونوں طرف سبز اور آپ جہاں بھی ہوں وہاں سے کشمیر کے آخری سرے تک کی دوری کو جوڑ دیں، ڈائل پر دوری درج ہے، سُرخ سوئی وہاں کر دیں گے، اور سُرخ رنگ کی روشنی کو بند کر کے جب چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں، اور جب میں آپ سے رابطہ کرنا چاہوں گا تو گھڑی کے نیچے آپ کی کلائی پر بار بار سوئی کی ہلکی نوک گڑے گی، یہ علامت ہوگی میری خواہش گفتگو کی ــــ" پھر مرزا نے اپنے ساتھی کی ایک گھڑی سوم ناتھ پٹواری کی کلائی پر باندھتے ہوئے کہا ــــ

" کشمیریوں کی پہچان میں آپ کو کوئی دقت نہ ہوگی، ویسے افراد جو کشمیری نہ ہوں ان پر نظر پڑتے ہی مجھے آگاہ کر دیں گے ــــ"

چاروں اخباری نمایندے اور تینوں سیاہ پوش ایک دوسرے سے انتہائی گرم جوشی سے ہاتھوں میں ہاتھیں ڈال رہے تھے، سوم ناتھ پٹواری ایک خالی بورا لاکر سیاہ پوش سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹے اپنے ہتھیار اس بورے میں ڈال دو، اور سامنے بستر پر فرن ہے پہن لو، پھر تمھیں جانے میں جو خطرہ لاحق ہے وہ ٹل جائے گا۔"

تینوں لباس بدل کر پوری طرح کشمیری نظر آنے لگے، تو سوم ناتھ پٹواری نے پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"لوہے کے اس ٹھوس پائپ کو مضبوطی سے پکڑ کر ایک سو پچاس کاٹھ کی سیڑھیاں گن کر نیچے اُتر جاؤ۔ یاد رہے کسی طرح کی روشنی ہرگز مت جلانا۔ نیچے اسی پائپ کو تھام کر بائیں سمت مڑ جانا، دس قدم کے فاصلہ پر ایک جھونپڑی ملے گی، اس کے اندر پیال پر دری بچھی ہے، چند کمبل بھی ہیں، وہاں پہنچ کر ہمیں آگاہ کر دینا۔ باری باری تینوں ٹھوس پائپ کے سہارے نیچے اُتر کر تاریکیوں میں گم ہو گئے۔ سوم ناتھ پٹواری کھڑکی بند کر کے جب پلٹا تو اخباری نمائندہ کملیش نے سوال کیا۔

"آپ زمانے کا اُتار چڑھاؤ دیکھے ہوئے ہیں۔ دیدہ ور نگاہیں بھی رکھتے ہیں۔ کیا مرزا پر پوری طرح بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔؟"

"نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اگر ان کی نیت صاف نہ ہوتی تو وہ رائفلیں چھوڑنے پر راضی نہ ہوتے۔" نیاز انتہائی خوش ہوتا ہوا بولا۔

"یہی نکتہ انتہائی اہم ہے۔ ہم نے جو پیار کا پیغام دیا ہے، اس کے نتائج دور رس ضرور نکلیں گے۔"

ہوٹل میں تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی طاری رہی۔ ہر دماغ کچھ نہ کچھ سوچتا رہا۔ کیا ایسا ہو پائے گا۔؟ وادیوں میں بہاریں آجائیں گی۔؟ کیا کشمیر پھر جنت بن جائے گا۔؟ برسوں پرانی محبت جگاتی ہوئی ہوائیں۔ ہندو مسلم دلوں کو ایک دوسرے سے ملا دیں گی۔؟

نیاز کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی نے سوئی چبھائی اور اطلاع ملی کہ وہ سب خیریت سے اس جھونپڑی میں پناہ لے چکے ہیں ـــ

اگلی صبح بھی ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی ، ریڈیو سے بار بار اعلان کیا جا رہا تھا کہ سری نگر جانے والی سڑک برف کے چٹانوں کے ڈھلک آنے کی وجہ سے آمد و رفت کے قابل نہیں ہے ، ممکن ہے اس کے کھلنے میں ایک دو دن لگ جائیں ـــ

اعلان سنتے ہی کرتار نے نیاز سے پوچھا ـــ

" اب کیا ارادہ ہے بابو ـــ ؟ "

" حصولِ امن کی راہ پر ہم نے روشنی پھیلا دی ہے ـــ ، اب آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ جس مقصد کے تحت ہم یہاں آئے تھے اس کو پانے میں ہمیں کہاں تک کامیابی حاصل ہوتی ہے ـــ "

چاروں نمائندے واپس ہو گئے ـــ

وقت کا پاؤں ہر لمحہ اپنا سفر پورا کرتا رہا ـــ ، کبھی کملیش کو ـــ ، کبھی نیاز کو ـــ ، کبھی مرزا اور کبھی سوم ناتھ پٹواری کے پیغامات ملتے رہے ـــ ، ہر کام انتہائی رازداری اور لگن سے پورا ہوتا رہا تھا ـــ ، مرزا کے تمام لوگوں نے گاؤں گاؤں کے گھر گھر سے تمام زر خرید قاتلوں کو جو فتنہ فساد کے بانی کو نکال نکال کر قانون کے حوالے کر دیا تھا ـــ ، اور مرزا کے تمام آدمیوں کے بچاؤ کے لیے فوج پوری طرح حرکت میں آ چکی تھی ـــ ، تقریباً ڈیڑھ سال کے وقفہ میں کشمیر کے حالات اعتدال پر آ گئے ـــ ، سڑکیں بارونق ہو گئیں ـــ ، شالیمار باغ اور نشاط باغ پھر سیاحوں سے بھر گئے ـــ ، شکارے ڈل جھیل میں تیرنے لگے ـــ اور بہاریں چھا گئیں ـــ ، پوری وادی جنت نظر آنے لگی ـــ ، الیکشن کے مطالبہ نے زور پکڑا ـــ ، اور امن پارٹی بھاری اکثریت سے الیکشن جیت کر اقتدار میں آ گئی ـــ

نئی پارٹی کے اقتدار سنبھالنے کے دوسرے دن وہ چاروں اخباری نمائندے جموں پہنچ گئے ـــ ،

نظارہ پہلے سے مختلف تھا ۔، سیاحوں کی ریل پیل تھی ۔ کرتار کی نظر جوں ہی ان پر پڑی وہ بے تحاشا دوڑ کر ان کے پاس پہنچ گیا، اور اپنے لبوں سے خوشی کی گنگا بہاتے ہوئے بولا ۔ " سب سے پہلے سوم ناتھ پٹواری سے ملوں گا ۔"

چند گھنٹہ کے اندر سوم ناتھ پٹواری کے ہوٹل کے سامنے ٹیکسی پہنچ کر رک گئی ۔، ہوٹل کھچا کھچ بھرا تھا ۔ نیاز نے ٹیکسی سے اُتر کر ہوٹل کے خوب صورت سائن بورڈ پر نظر ڈالی ۔ لکھا تھا ۔

" اَمن کا پہلا پڑاؤ "

سوم ناتھ پٹواری اور اُن کے بیٹے، نیاز اور اُن کے ساتھیوں کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے کہ وہ امن کے فرشتے ہوں ۔!

□□□

ثبوت کوئی ثبوت

اکھڑے ہوئے روڑوں سے بھری سڑک کے کنارے درخت کی چھاؤں میں ایک بوڑھا آدمی اپنے آگے بکس رکھے خالی رکشا کے انتظار میں کھڑا تھا۔ رجیا نے اس کا اشارہ پاکر رکشا روکتے ہوئے پوچھا ــــ

"کہاں جاؤ گے بوڑھے بابا ــ ؟"

"اشوک مارگ پر ایک سونار کی دُکان پر تنک کام ہے بچوا ــ پھر اسٹیشن لے جاکر چھوڑ دینا ــ کتنا لوگے ــ ؟"

رجیا نے اس کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا ــ اپنے پہناوے سے وہ گاؤں کا نظر آیا، موٹا اسامی سمجھ کر اس کے آگے چارا ڈالا ــ بڑی سادگی سے بولا ــ

"اُچت سمجھ کر دے دینا ــ"

"اُچت کا پھیرا کبھی مہنگا بھی پڑ جاتا ہے بچوا ــ نہیں بچوا، بھاڑا صاف بولو ــ !"

بوڑھا معنی خیز انداز میں مسکرایا ــ

کرایہ طے پاتے ہی بوڑھا، بکس رکھنے کے بعد رکشا پر بیٹھ گیا ــ رجیا نے اپنے ہونٹوں کے اندر دبی ہوئی کھینی سے نکلے ہوئے لعاب کو بیچ سڑک پر تھوکا، جیسے کہ اس نے انسانی

رشتوں کے درمیان منافرت پھیلانے والے سیاسی مجرموں کے روشن چہروں پر تھوک دیا ہو۔
اور پھر دن اور رات کے گھومتے ہوئے چکر کی طرح اس کے پاؤں رکشا کے پیڈلوں کے ساتھ گھومنے لگے، دُکان کے سامنے پہنچ کر رجیا نے رکشا روکا تو تھکن سے وہ ہانپ رہا تھا، اور اس کا افلاس زدہ پیٹ بار بار پھول اور پچک رہا تھا ۔ بوڑھا رکشا سے اتر کر سیدھا دُکان میں چلا گیا، رجیا نے کھڑے کھڑے گردن جھکا کر اپنی پیشانی پر پھیلے ہوئے پسینہ کو انگلیوں میں سمیٹ کر ایک طرف ٹپکایا، قطرہ قطرہ ٹپکا ہوا پسینہ چھوت کے امراض کی طرح سڑک پر پھیل گیا رجیا رکشا پر بیٹھ کر سستانے لگا، ابھی اس کی سانس کی رفتار پوری طرح معمول پر بھی نہیں آئی تھی، کہ ایک کار تیزی سے آ کر رکشا کے قریب رکی، اس سے دس بارہ خوش پوش نوجوان پھرتی سے اُتر کر چند دُکان کے اندر گھس پڑے ۔ اور چند لائن بندی کر کے کھڑے ہو گئے اور باہر کھڑے ایک نے رجیا کو مخاطب کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا ۔

"ارے ۔ او ۔ رکشا والے ۔ چل پھوٹ جلدی ۔"

شہر میں رہتے رہتے نئی نئی وارداتوں کی خبریں سُن سُن کر رجیا بھی بہت کچھ جان گیا تھا ۔ خطرے کو وہ فوراً تاڑ گیا ۔ اُچھل کر رکشا کی سیٹ پر بیٹھا اور وہاں سے بھاگ نکلا، بھاگتا رہا۔ کچھ دور نکل آنے کے بعد تعاقب کے امکان کا سوچ کر وہ یکایک گھبرا گیا ۔ رکشا چلتا رہا ۔ پل بھر کے لیے اس نے اپنی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا پھر اطمینان کی سانس لے کر وہ اپنے رکشا کو بنّو میاں کی چال کے احاطے میں لے آیا جہاں وہ ایک کوٹھری میں رہتا تھا، یہ چال وسیع کھلے میدان میں ہونے کی وجہ سے شہر میں مشہور تھی ۔ دراصل یہ موجودہ چال پہلے کوئی انگریز کے گھوڑے کا بڑا سا اصطبل تھا ۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد جب وطن لوٹ رہا تھا تو اس نے اپنے بٹلر بنّو میاں کی کارگذاریوں سے خوش ہو کر بخشش میں وہ اصطبل اس کے نام لکھ دیا تھا ۔ بنّو میاں خون بہائے بغیر گردن کاٹنے کا گُر انگریزوں سے سیکھ چکا تھا ۔ پہلے وہ گھوڑوں کی خوراک میں کٹوتی کا راز جان کر سائیس کی آمدنی میں حصہ دار بنا تھا، پھر اس نے اصطبل میں چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنوا کر مزدوروں کی نگاہوں میں اپنا قد اور مقام اونچا کیا تھا ۔

اور انھیں سر چھپانے کی جگہ دے کر بڑی شان سے ان کی کمائی ان سے چھین رہا تھا۔
رکشا کو مخصوص جگہ پر لگا کر رجیا نے چاروں طرف دیکھا۔ روز کا دھندا کر کے جینے والے سب اپنے اپنے دھندوں پر نکل چکے تھے۔ رجیا نے جلدی سے بکس کو کوٹھری میں رکھ کر باہر سے قفل لگا دیا۔ خوف کا گھٹتا بڑھتا ہوا احساس اس کے دل پر پھیلا ہوا تھا۔ اس احساس سے نجات پانے کے لیے وہ چائے کی دکان پر آ کر ایک ایک گھونٹ کر کے چائے پینے لگا۔ گرم چائے ٹھنڈی ہوتی رہی، سکون پا کر خوف کا پھیلا ہوا احساس جوں ہی اس کے دل سے نکلا، ٹھیک اسی وقت ایک آدمی دکان میں داخل ہوتا ہوا بولا۔
"دن دہاڑے اشوک مارگ پر ڈکیتی ہوئی ہے، دو مرے ہیں اور دس گھائل ہیں۔"
رجیا کا دماغ چھن سے ہو گیا۔ اس حادثے میں اس کے ملوث کر دیے جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ بے چین ہو کر وہ دکان سے نکل پڑا۔ ممکن ہے کہ گھائلوں میں وہ بوڑھا بھی ہو جس کو اس نے دکان کے سامنے رکشا سے اتارا تھا۔ بکس اس کے حوالے کر کے خود کو اس جھنجھٹ سے نکال سکتا ہے۔ یہ خیال اتنا وزن دار تھا کہ وہ سیدھا جنرل ہسپتال کے سرجیکل وارڈ کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ پولس کی گاڑیاں وارڈ کے آگے لگی ہوئی تھیں۔ یکایک اس کے ذہن میں بجلی کی طرح راگھو کی یاد چمکی، جو اس کی نگاہوں کے سامنے مار کے عذاب سے چھٹکارا پانے کے لیے ناکردہ جرم قبول کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ بے بسی کا وہ نظارہ انتہائی دل ہلا دینے والا تھا۔ خوف زدہ ہو کر وہ وہاں سے پلٹا اور ہارڈنگ پارک پہنچ گیا، جائے واردات سے ہارڈنگ پارک کا فاصلہ طویل تھا۔ پارک کے اندر گھاس کے قدرتی سبز فرش پر شہر کے شور ہنگامے اور دھوئیں کی کثافتوں سے اکتائے ہوئے لوگ وقتی سکون کی تلاش میں جگہ جگہ ٹولیاں بنائے ہوئے بیٹھے تھے۔ رجیا اپنے پیٹ کی طلب پوری کرنے کے لیے ایک جگہ پر بیٹھ کر چنا چبانے لگا۔ اس کے ٹھیک سامنے ایک نوجوان کے قریب ایک بچہ بیٹھا ہوا ڈبے سے پوری نکال کر کھا رہا تھا اور اس سے دو قدم کے فاصلے پر دو کتے رزق پانے کے انتظار میں اپنے اگلے پاؤں کے سہارے بیٹھے ہوئے پوری ٹکٹکی لگائے تھے۔ بچوں کے کومل دلوں

میں جانوروں کے لیے بڑی چاہتیں ہوتی ہیں ۔ وہ بچہ بھی چاہت سے مغلوب ہو گیا ۔ اس نے پوری کے ٹکڑوں کو کتوں کی طرف جوں ہی اُچھالا ، کتوں کے پانے کے پہلے تاک لگائے کوؤں نے اُڑتے ہوئے ہواؤں میں ان ٹکڑوں کو اپنے چنگلوں میں دبالیا اور اونچی اُڑان بھر کر درخت کی پھُنگی پر جا بیٹھا ۔ کتا اس کی پرچھائیوں کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک بھونکتا ہوا گیا اور مایوس ہارے ہوئے جواری کی طرح لَوٹ آیا ۔ رجیا بیٹھا ہوا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا ۔ دینے اور پانے کے اس عمل سے بڑی تیز روشنی پھوٹی ۔ اس نے اپنے ذہن کی آنکھوں سے اس روشنی کو دیکھ کر اشارہ پالیا ۔ پارک سے نکل کر جب وہ چال کے سائبان میں پہنچا تو اس کا ساتھی رامو گانجے کا دم لگا رہا تھا ۔ اس کو دیکھتے ہی پوچھا ۔

”دن بھر کہاں غایب تھا رجیا ۔“

رجیا نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا ۔

”مت پوچھ یار ۔ سسری بوڑھیا نے آج بھیجہ چاٹ لیا ۔“

”کون بوڑھیا ۔ ؟“ رامو نے گانجے بھری چلم رجیا کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا ۔

”ہے ۔ میرے گاؤں کی ، دوا دارو لینے آجاتی ہے ۔“ رجیا کی خیالی بوڑھیا کی فرضی کہانی ختم ہو گئی ۔ وہ بڑی صفائی سے حقیقت چھپانے میں کامیاب ہو کر گانجے کا دم لگانے لگا ۔ !

رامو اپنے ہاتھوں پر سر رکھ کر لیٹتا ہوا بولا ۔

”چال میں آج ایک سپاہی آیا تھا ۔“

رجیا چونک گیا ۔ جلدی سے اس نے مُنھ سے دھواں چھوڑتے ہوئے پوچھا ۔

”کس لیے رامو ۔ ؟“

اپنا نتھوا اُسی کے گاؤں کا ہے ۔ باڑھ کا حال اس سے معلوم کرنے آیا تھا ۔“ رامو نے جواب دیا ۔

خوف کا منڈلاتا ہوا پرندہ جو پنکھ پھیلا کر رجیا کے دل پر اُترنے والا تھا ، پھُر سے اوپر

اُڑ گیا ، اس نے اطمینان سے گانجے کا آخری دم لگا کر چلم رامو کو لوٹاتے ہوئے بولا ۔
" بدن دُکھ رہا ہے ۔ چلا سونے رامو ۔"
رجیا نے اپنی کوٹھری اندر سے بند کر کے بکس کھولا ، اس کے اندر قیمتی کپڑے ۔ سنہرے روپہلے گوٹوں کے چمکتے ہوئے کئی ہار تھے ۔ بکس کے دراز سے صرف ایک خط نکلا ، وہ نویں جماعت پاس تھی ، خط پڑھتے پڑھتے دل ہلا دینے والا وہ منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا جو دیکھ چکا تھا۔ ایک مہینہ پہلے اس کی بہن کا ہونے والا دولہا طے شدہ چیزیں نہ پاکر لگن منڈپ میں بیٹھنے سے انکار کر کے ندارد ہو گیا تھا ۔ اور یہ خبر شادی کا جوڑا پہنے ہوئے اس کی بہن کی موت کا باعث بنی تھی ۔ خیال کا تیز جھونکا رجیا کے دل کو چھو کر اس کو رُلاتا ہوا گذر گیا ۔ کئی بار خط پر لکھا ہوا پتہ پڑھنے کے بعد رجیا اپنے سر پر بکس اٹھائے جوں ہی بنّو میاں کی چال کے احاطے سے نکل کر سڑک پر آیا ، یکایک ایک جیپ اس کے سامنے رک گئی ۔ اس سے تیزی سے اُتر کر سپاہیوں نے رجیا کو اپنے گھیرے میں لے لیا ۔ سپاہیوں کے ساتھ وہ بوڑھا بھی تھا جو رجیا کے رکشا سے دُکان کے سامنے اُترا تھا ، اس نے رجیا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا ۔
" دھرا گئے نارنگے ہاتھ بچوا ۔ اب مرد کال کوٹھری میں ۔"
اپنی صفائی میں رجیا لاکھ سچ بولتا رہا ۔ سچ اُگلتا رہا ۔ لیکن ثبوت کی بیساکھی کے سہارے چلنے والا قانون اس کی سچائی کی پاسداری کرنے میں بُری طرح ناکام رہا ۔ !

□□□

انسانیت

ٹرین کافی لیٹ ہوگئی تھی ___، جب وہ اسٹیشن پر اُترا تو رات پھیل چکی تھی ___، مضافاتی چھوٹا سا اسٹیشن ہونے کی وجہ کر وہاں مسافروں کی سہولت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ وہاں سے اس کا گاؤں چار کیلومیٹر کے فاصلے پر تھا ___، رات اندھیری تھی ___، رستہ مخدوش تھا ___، لیکن جانا ضروری تھا ___، کیونکہ جب اس کو اپنی بیوی کی علالت کا تار ملا تھا ___، نہ جانے اس کا کیا حال تھا ___، کیا ہوا تھا اس کو ___، ابھی پچھلے مہینے جب وہ گاؤں سے آیا تھا، وہ بالکل بھلی چنگی تھی، اس نے اس سے بار بار کہا تھا کہ وہ شہر میں اپنا خیال رکھا کرے ___

کئی منٹ تک وہ پلیٹ فارم پر کھڑا سوچتا رہا ___، راہ میں جان کا خطرہ تھا ___، لُٹنے کا ڈر تھا ___، ان علاقوں میں اَن گنت خون ہو چکے تھے ___، کتنے ان راہوں پر لُٹے تھے ___، وہ سارے کے سارے علاقے مزدور اور کسان کی جنگ میں کئی بار جلے تھے ___، مزدور اپنی حیات کی بقا کی خاطر، اپنے حقوق کو پانے کے لیے درانتی اٹھائے، اور کسان اپنے خاندانی وقار اور جائداد کی حفاظت کرنے کے لیے بندوق تانے رہتے تھے ___، اور اکثر بھولے راہ گیر ان دونوں کی غلط فہمیوں کا شکار ہو کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے ___

اسٹیشن سے باہر نکل کر اس نے گاؤں جانے والی سڑک کی طرف دیکھا ___، اندھیرے

میں بالکل ڈوبی ہوئی تھی ــــ ساکت اور خاموش ــــ صرف ہلکی چلتی ہوئی ہوا میں مٹی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔
اس نے حوصلے کو جگایا ــــ ہمت کو سمیٹا ــــ دل کو ٹٹولا ــــ وہ گاؤں پہنچنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔
اس کے پاؤں سڑک پر اٹھنے لگے ــــ غضب کا اندھیرا پھیلا تھا ــــ ہوا سے جب تاڑ کے پتے بج
اٹھتے تھے تو اس کے بدن میں ہلکی سی کپکپی ہوتی تھی ــــ کچھ دور چلنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ
کوئی اس کے پیچھے آرہا ہے ــــ گہری تاریکی میں وہ کچھ دیکھنے سے قاصر تھا ــــ اس نے رک
کر قدموں کی چاپ سننے کی کوشش کی ــــ لیکن وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا ــــ پھر وہ ہلکے ہلکے
قدموں سے چلنے لگا ــــ یکایک اس کے کانوں میں تیز آواز آئی ــــ

"رُک جاؤ ! ــــ ورنہ گولی مار دوں گا ــــ"

اس کے قدم زمین پر جم گئے ــــ خطرہ قریب تھا ــــ بدن کانپا ــــ دل بیٹھا ــــ اور
وہ ساکت و جامد ہوگیا ــــ

"تم کون ہو ــــ؟" آواز پیچھے سے آئی ــــ

خوف سے اس کا برا حال تھا ــــ ہونٹ کانپے ــــ لیکن زبان تالو سے چمٹی رہی ــــ

"جواب کیوں نہیں دیتے ــــ؟" ــــ کوئی نوکیلی چیز اس کی پیٹھ پر ٹِک گئی ــــ

"گولی مار دوں ــــ؟"

"نہیں ــــ نہیں ــــ ایسا نہ کرنا ــــ" وہ گھگھیا کر بولا ــــ "میں شہر میں کام کرتا ہوں
اور نور پور جا رہا ہوں ــــ"

"بڑے نڈر ہو ــــ اتنی رات گئے اکیلے ــــ تب تو تم ضرور نور پور کے کسان خاندان کے
ہوگے ــــ" اس انجان نے کہا ــــ

"میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ــــ غریب سے امیر کا کیا رشتہ ؟ ــــ رشتہ ہونے پر
بھی قائم نہیں رہتا ــــ ساری دنیا میں زمین نے کہیں آسمان کو چھوا ہے ــــ" اس نے خود کو
سنبھالتے ہوئے کہا ــــ

"پڑھے لکھے لگتے ہو ــــ کہاں تک تم نے پڑھا ہے ، اور شہر میں کیا کرتے ہو ــــ؟"

اس نے پھر سوال کیا۔

"یوں تو بی۔اے پاس ہوں۔ لیکن چنا چج کر جینے کی کوشش میں لگا ہوں۔" حامد نے بڑی مایوسی سے کہا۔

"ہو جیالے۔ ہمت رکھتے ہو۔ ورنہ میں کتنے پڑھے لکھے لوگوں کو دیکھ چکا ہوں جو ملازمت نہ پانے پر برائیوں کو اپنا کر اپنی زندگی تباہ کر دیتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "چلو میں بھی نور پور کے قریب ہی ایک گاؤں میں جا رہا ہوں۔"

دونوں قدم سے قدم ملا کر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد قدرے حوصلہ پا کر حامد نے اس سے پوچھا۔

"آپ اتنی رات گئے کیوں جا رہے ہیں۔؟"

"اس گاؤں کے کسان سے اپنا حساب چکانے۔ آج اس نے میرے باپ کو گولی ماردی ہے۔" اس نے بڑے روکھے پن سے کہا۔

"گولی ماردی۔؟ مگر کیوں۔؟" حامد سخت حیران تھا۔

"میرا باپ پاگل تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کسان سے اپنی واجب مزدوری مانگی تھی۔ اور اس کے نہ دینے پر اس کے کھیتوں پر کام کرنے سے اپنے تمام ساتھیوں کو منع کر دیا تھا۔ کتنا سخت جُرم کیا تھا اس نے۔؟ سزا معمولی تھی۔ مَیں بھی اسی طرح کی سزا اس کو دینے جا رہا ہوں"

حامد کا دل اندر ہی اندر بیٹھ گیا۔

"اس دھرتی پر کیا کیا ظلم اب تک مروّج ہے۔؟ اس زمین پر رہنے بسنے والوں نے کیا اسی طرح کے دن دیکھنے کی خاطر آزادی کی جنگ لڑی تھی۔؟ ملیانہ۔ چندیری کے خونیں واقعات کو دنیا کس طرح بھلا سکتی ہے۔؟ کہاں گیا سیکولرزم؟۔ صدیوں پرانی روایات نے دم توڑ دیا۔؟ ہندو مُسلم قومی یک جہتی پر دیا جانے والا مثال کے طور پر مہاتما گاندھی اور شیر شاہ سوری کی نگری بھی فرقہ داریت کی آگ سے نہ بچ سکی۔ یہ دیش تو درندوں کا دیش بنتا جا رہا ہے۔ جہاں قانون کی سخت گرفت ہونے کے باوجود قانون کی اہمیت کچھ نہیں ہے۔ یہاں

آدمی اب تک وہی آدمی ہے جو کبھی ننگا اور وحشی تھا۔ انسانیت کی عظیم قدروں سے ناواقف، شان و شوکت کی خاطر ظلم و تشدد سے گریز نہ کرنے والا۔ پنجاب اور آسام جل رہا ہے۔ کشمیر کی خوب صورتی پر کہرا چھایا جا رہا ہے۔ کہیں مذہب۔ اقتدار اور منصب کی خاطر آدمیوں کو لڑایا جا رہا ہے۔"

"تم خاموش کیوں ہو گئے۔؟"

اس نے حامد سے کہا۔

حامد اپنے خیالوں کی گہرائیوں سے اُبھر آیا۔ آہستگی سے بولا۔

"آپ پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ پھر بھی میری رائے ہے کہ آپ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔"

"یعنی میں اپنے باپ کے قاتل کو قانون کے حوالے کر دوں۔؟ اور انصاف کا انتظار کروں۔؟" اس نے کہا۔

"جی۔!" حامد کا مختصر جواب تھا۔

"اور تم سمجھتے ہو کہ میرے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔؟ تم اپنے دیش کے نہیں لگتے بھائی۔؟ یہاں انصاف خریدے جاتے ہیں۔ گواہ خریدے جاتے ہیں۔ اگر اس کا چلن نہیں ہوتا، تو خون کر کے قاتل سینہ تان کر نہیں چلتے۔ قانون کی سختی اگر دور رہتی تو اپنے دیش پر ظلم و تشدد کے بادل کیوں چھائے رہتے۔؟" اس نے کہا۔

"بُرائی کا جواب بُرائی سے تو نہیں دینا چاہیے۔" حامد نے کہا۔

"تم تو رام، یسوع، محمدؐ اور گرونانک کے پیرو لگتے ہو۔؟ لیکن رام، یسوع، محمدؐ اور گرونانک کے ماننے والوں نے بھی ظلم کے خلاف جنگیں کی تھیں۔ کیا یہ سچ نہیں؟" اس نے کہا۔

حامد لاجواب ہو گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔

پھر اس نے کہا۔

"برائی کو ختم کرنے کے لیے خود برا بن جانے سے برائی ختم نہ ہو گی ۔ ایک خون کے جواب میں دوسرا خون ہو گا ۔ اور اس کے بدلے میں تیسرا ۔ اور یہ سلسلہ نہ ختم ہونے والا بن جائے گا ۔ قانون کا شیرازہ بکھرے گا ۔ سماج میں افراتفری پھیلے گی ۔ اور دیش کے امن کو خطرہ لاحق ہو جائے گا ۔ میری رائے ہے کہ آپ انتقام کے جذبے کو اپنے دل سے نکال دیجیے ۔"

وہ چلتا رہا ۔ لیکن خاموش رہا ۔

"مَیں مانتا ہوں کہ آپ کے ساتھ ظلم کیا گیا ہے ۔ آپ کے اس عظیم نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی ۔ پھر بھی اگر آپ ضبط سے کام لیں گے تو آپ کے خاندان کی عظمت برقرار رہے گی ۔" حامد نے کہا ۔

وہ پھر بھی خاموش رہا ۔

چلتے ہوئے دونوں نور پور گاؤں کے قریب پہنچ گئے تھے ۔

حامد نے پھر کہا ۔

"آپ رات میرے یہاں قیام کر لیں ۔ مَیں بھی تو آپ کا بھائی ہوں ۔"

وہ حامد سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگا ۔

روتے ہوئے بولا ۔

"میرا باپ بڑا سیدھا آدمی تھا بھیا ۔ وہ انصاف کے لیے آواز بلند کر رہا تھا ۔ اور گولی کھا کر سو گیا ۔ میں اس ظلم کو کس طرح سہن کر لوں ۔ ؟"

"ہمت سے کام لو ۔ صبر و ضبط کرنے والے خدا کو بہت پسند ہیں ۔ تم میرے یہاں قیام کر کے چلے جانا ۔"

پھر وہ ساتھ ساتھ حامد کے گھر پر آ گیا ۔

حامد کی بیوی اچھی ہو چکی تھی ۔ رات اس نے مہمان کی ہر طرح سے دل جوئی

کی اور صبح جب وہ جا رہا تھا تو سمندر میں آیا ہوا طوفان ختم چکا تھا ۔۔۔ انسانیت کے نور سے اس کے دل کو سکون مل گیا تھا ۔۔۔ !

❑❑❑

آوارہ خط کا سفر

تخلیق کار نے اپنا طویل خط مکمل کر کے بڑا ذہنی سکون محسوس کیا ۔۔۔ خط میں ڈھکی چھپی تلخ سچائیوں کو بڑی خوب صورتی سے بے نقاب کیا گیا تھا ۔۔۔ اس ترقی یافتہ دور کے سماج میں بربریت کے جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں اس کا عکس اس خط میں موجود تھا ۔۔۔

ایک طلب تخلیق کار کے دل کو بہت دیر سے ٹھوکے دے رہی تھی ۔۔۔ وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا ۔۔۔ ٹھیک اسی وقت دھول سے بھری ہوئی آندھی کا تیز جھونکا اس خط کو ٹیبل سے اُڑ کر فضاؤں میں چلا گیا۔ فضاؤں میں پتنگ کی طرح قلابازیاں کرتا رہا ۔۔۔ ہوا کا دباؤ جیسے جیسے کم ہوتا گیا، وہ خط نیچے گرنے ہی والا تھا لیکن دوسرے رُخ سے چلتی ہوئی ہوا نے اس کو اُڑا کر کھڑکی سے ایک دفتر میں ڈھکیل دیا ۔۔۔ دفتر ایک جریدے کا تھا ۔۔۔

مدیر نے جب کئی اوراق پر مشتمل خط کو فرش پر دیکھا تو اس کو گمان ہوا کہ کوئی مسودہ فائل سے گر پڑا ہے ۔۔۔ اٹھایا اور غور سے دیکھا ۔۔۔ اس کا دستخط اس پر نہیں تھا ۔۔۔ مدیر کا طریقہ کار تھا کہ جب کوئی مسودہ موصول ہوتا تھا تو وہ فوراً پر اپنا دستخط کر کے تاریخ نوٹ کر دیتا تھا ۔۔۔ وہ خط ۔۔۔ انتہائی دل کش تحریر میں لکھا ہوا تھا ۔۔۔

مدیر پڑھنے لگا ۔۔۔ پہلا حصہ خشک اور منطقی تھا ۔۔۔ لیکن تیسرے ورق پر جب اس کی نظر

پڑی وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ۔۔۔ جو کچھ اس میں درج تھا وہ حقیقت تھی ۔۔۔ اس نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ وہ اس خط کو "روشنی" کے آنے والے شمارہ میں ضرور شائع کرے گا ۔۔۔ کاتب کو طلب کر کے اس خط کو دیتے ہوئے کہا ۔۔۔

"اس کو کتابت کر کے آئندہ شمارہ کے مسودوں میں شامل کر لو ۔۔۔"

کاتب اس خط کو رکھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگا ۔۔۔ یکایک کھڑکیوں کے پٹ تیز ہواؤں سے بجنے لگے اور ہواؤں کے تیز جھونکے کے ساتھ وہ خط دفتر کی قید سے نکل کر فضاؤں میں اڑتا ہوا اوپر اٹھتا ہوا اور دور کا سفر طے کر کے ببول کے درخت کے کانٹوں میں پھنس گیا ۔۔۔

ببول کے درخت اور اس کے کانٹے اپنی خصوصیت کی وجہ سے انسانی نفرت کا شکار ہوئے ہیں ۔۔۔ لیکن صرف ایک بار ببول کے درختوں کو انسانوں کا قرب حاصل ہوا تھا ۔۔۔ انسانی انگلیوں کی حدت اس کے کانٹوں میں جذب ہوئی تھی ۔۔۔ وہ زمانہ عالمی جنگ کا تھا، جب پنوں کے کارخانوں میں انسانی ہلاکت کے سامان تیار ہونے لگے تھے ۔۔۔ اور ببول کے کانٹوں کو پنوں کا درجہ عطا کیا گیا تھا ۔۔۔ اس وقت حصولِ روٹی کی خاطر روزانہ اُجرت پر نہتے افراد ببول کے درختوں سے کانٹے توڑتے تھے ۔۔۔

چرواہے کے چند لڑکے بھینسوں کی پشتوں پر سوار ہو کر گیلی مٹی کے گولے ایک دوسرے پر پھینک کر ایک نئے کھیل کا آغاز کر رہے تھے کہ ایک گولہ نشانے سے ہٹ کر ببول کے درخت کے اس حصے پر پڑا جہاں وہ خط اٹکا ہوا تھا، خط وہاں سے پھر اڑا اور ہواؤں کے سہارے اڑتا اڑتا شیشم کے تناور درخت کی ایک ٹہنی میں اٹک گیا ۔۔۔

شیشم کے درخت کو ایک آدمی ٹانگی سے کاٹ رہا تھا ۔۔۔ شیشم سے دور ہٹ کر اس کی دس سالہ لڑکی بیٹھی تھی اور کہہ رہی تھی ۔۔۔

"بابو ۔۔۔ اس درخت کو مت کاٹو ۔۔۔ یہ میری ماں نے لگایا تھا ۔۔۔ میرا جب بھی من گھبراتا ہے، میں اس کے پاس آ کر بیٹھتی ہوں اور مجھے ان کا پیار مل جاتا ہے ۔۔۔"

"مجھے بھی اس کے کٹنے کا بہت دکھ ہے بیٹی ۔۔۔ پر ۔۔۔ تو اپنے کپڑے دیکھ ۔۔۔ جگہ

جگہ پیوند لگے ہیں اور وہ بھی پھٹ رہے ہیں ۔۔۔ اب تیری ماں تو نہیں جو پیوند لگائے گی، تو اپنی دادی کو دیکھ، دوا کے بنا وہ مرنے کے قریب ہے ۔۔۔ تیری زمین پر کاشت نہ ہوگی ۔۔۔ اناج نہ ہوگا تو ہم تینوں کھائیں گے کیا ۔۔۔؟ اس شیشم کو بیچ کر تیرے لیے کپڑا لاؤں گا اور تیری دادی کے لیے دوائیں اور کاشت کا انتظام کروں گا ۔۔۔"

جیسے جیسے درخت کٹتا گیا لڑکی کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں ۔۔۔ باپ کا دل تڑپ اٹھا ۔۔۔ پر مجبوری کے جال میں وہ پوری طرح اُلجھا ہوا تھا ۔۔۔ بیٹی کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا ۔۔۔

" میں آج ہی تجھے ایک پیڑ کا پودا لا دوں گا ۔۔۔ اسی جگہ اس کو لگا دینا ۔۔۔ وہ تجھے ماں کی یاد دلاتا رہے گا ۔۔۔"

شیشم کے تناور درخت کے زمین بوس ہوتے ہی اس کی ٹہنی میں اُلجھا ہوا خط آزاد ہو کر وہاں سے ہواؤں کی گود میں بیٹھ گیا ۔۔۔ ہواؤں نے اس بار اس کو ایک سیاسی رُکن کے روم میں اُتار دیا ۔۔۔

سیاسی رکن نے حیرت سے اس خط کو دیکھا اور اس کو اٹھایا ۔ خط پڑھتے پڑھتے کئی بار اس کی پیشانی پر بَل پڑے ۔ کئی بار اس کی بھویں تنیں ۔۔۔ اس نے اپنے شوفر کو طلب کر کے تخلیق کار کا پتہ دیتے ہوئے کہا ۔۔۔

" انھیں عزت و احترام سے فوراً لے آؤ ۔۔۔"

سیاسی رکن نے تخلیق کار کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا ۔۔۔ پتہ نہیں اس کے رویّہ کے اندر کوئی سیاسی چال چھپی تھی ۔۔۔ یا اس کی عادت کا چلن تھا ۔۔۔ کچھ دیر تک سیاسی رُکن تخلیق کار سے باتیں کرتا رہا ۔۔۔ پھر مُسکراتے ہوئے کہا ۔۔۔

" یقیناً آپ مبارک باد کے مستحق ہیں، کیونکہ آپ نے تلخ سچائیوں کو بڑی خوبصورتی سے بے نقاب کیا ہے ۔۔۔"

" آپ سے ایک بڑی بھول بھی ہوئی ہے ۔۔۔"

تخلیق کار یکایک چونک اٹھا ـــ وہ بھول کیا تھی وہ سمجھ نہیں پایا ـــ بڑی متانت سے پوچھا ـــ

"کیا بھول ہوئی ہے سر ـــ ؟"

"تنکے پر تو آپ کی نظر پڑی ـــ لیکن شہتیر دیکھ نہیں پائے ـــ"

تخلیق کار سوچ میں ڈوب گیا ـــ کچھ جان نہیں پایا کہ سیاسی رُکن کے کہنے کا مدعا کیا ہے ـــ ؟"

"تخلیق کا فرض ہے کہ وہ تصویر کا دونوں رُخ عوام کو دکھائے ـــ لیکن آپ نے ایسا نہ کر کے دوسروں کا نقصان کیا ہے ـــ کیا یہ سچائی نہیں کہ آزادی کے بعد ملک ترقی کر کے زمین سے آسمان کی طرف جا پہنچا ہے ـــ عوام کو کئی طرح کی سہولتیں بخشی گئی ہیں ـــ پتہ نہیں آپ جیسا تخلیق کار اپنے مقام سے اونچا اٹھنا کیوں نہیں چاہتا ـــ ؟" سیاسی رکن نے کہا ـــ

تخلیق کار نے فوراً کہا ـــ

"ہم اپنی عزت اور وقار کو داؤں پر لگا کر اوپر اُٹھنے کے قائل نہیں ہیں ـــ"

"کوئی بھی دانش مند ایسا نہیں چاہے گا ـــ آپ کے لکھنے کا انداز دل کش ہے ـــ بڑی خوب صورتی سے آپ نشتر زنی کرتے ہیں ـــ آپ اپنی زندگی میں بدلاؤ لانے کے خواہاں ہیں تو میں آپ کو ایک سہل راستہ دکھاؤں ـــ" سیاسی رکن نے کہا ـــ

"وہ راستہ کانٹوں بھرا نہ ہو تو بتائیں ـــ" تخلیق کار نے کہا ـــ

سیاسی رکن بے اختیار ہو کر ہنس پڑا ـــ پھر بولا ـــ

"مَیں تعمیری خیالات کی قدر کرتا ہوں ـــ تخریب کی ہرگز نہیں ـــ میری خواہش ہے کہ آپ تاریکیوں سے نکل کر اُجالے میں آجائیں ـــ آپ کی سوچ میں گہرائی ہے ـــ اس طرح کا ایک خط اور تحریر کریں ـــ "آوارہ خط کی واپسی کا سفر" ـــ اور اس خط میں میری پارٹی کے کارناموں کا تفصیل سے تذکرہ کریں ـــ"

"لیکن سر ـــ مجھے تو معلوم نہیں کہ آپ کا تعلق کس پارٹی سے ہے ـــ ؟" تخلیق کار

نے کہا ___

"میرا تعلق ہمیشہ برسرِ اقتدار پارٹی سے رہتا ہے ___ خواہ کوئی پارٹی ہو ___ آپ کے خط کی اشاعت کے بعد مٹھی بھر عوام جو ہماری پارٹی سے بدظن ہیں ___ یقیناً ان کا برین واشش ہو جائے گا ___ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے جشنِ آزادی کے موقع پر اس گراں کام کے عوض میں دس ہزار کا چیک، ایک سند اور وظیفہ کا حکم نامہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔" سیاسی رُکن نے کہا ___

"اب مجھے اجازت دیں ___ ؟" تخلیق کار نے پوچھا ___

"ہاں بھئی، آپ میری قید میں تو ہیں نہیں ___ یہ آپ کی مرضی پر ہے کہ آپ میری خواہش کا احترام کریں یا نہ کریں ___" سیاسی رکن نے مسکراتے ہوئے کہا ___

"روپیہ سے زندگی کا بڑا گہرا رشتہ ہے ___ اسی کے حصول کے لیے ساری دنیا میں انسان کیڑوں کی طرح رینگتے ہیں ___ ان میں ایک میں بھی ہوں ___ جلد ہی آپ ___ "آوارہ خط کی واپسی کا سفر" ___ کے حالات کسی جریدہ میں دیکھ لیں گے ___، اس کی ایک کاپی میں آپ کو بھجوا دوں گا ___" تخلیق کار نے کہا ___

"آوارہ خط کی واپسی کا سفر" کی اشاعت کے بعد عوام، جو اس کے فن کے قدرداں تھے ___ اور تعریفی خطوط لکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، ___ وہی قدرداں اس کو طرح طرح کے گندے خطابات سے نوازنے لگے تھے ___ اس کا کئی بار خُون کھولا تھا ___ اس کو ندامت کا احساس ہوا تھا ___ اور کئی بار پچھتاوا کی آگ میں جلا تھا ___، لیکن جشنِ آزادی کے دن دس ہزار روپیہ کا چیک، سند اور وظیفہ کا حکم نامہ ملا تو اس نے عوام کی بدظنی کو بُھلا دیا تھا۔

ڈھلتی ہوئی رات میں بلی نے کھڑکی سے ٹیبل پر چھلانگ لگائی۔ ٹیبل پر رکھا ہوا پانی سے بھرا شیشے کا گلاس فرش پر گرا۔ چھناک کی آواز سے تخلیق کار جاگ اُٹھا ___ لائٹ کو آن کیا ___ فرش پر کانچ کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھا ___ پھر لائٹ کو آف کر کے مُسکراتے ہوئے بستر پر دراز ہو گیا ___ !

سچّا رشتہ

فیاض صاحب اپنے ہاتھ میں بریف کیس اٹھائے باغ سے گذر رہے تھے۔ درختوں کی ٹہنیوں سے جھڑے ہوئے پتے ان کے پاؤں کے دباؤ سے چُرمرا کر ٹوٹ رہے تھے، اور اس کی آواز ان کے جسم کی رگوں میں سنسناہٹ دوڑاتی ہوئی دماغ میں یہ احساس جگا رہی تھی کہ ان کا وجود بھی ان پتوں کی طرح ٹوٹ چکا ہے۔ اس احساس کے اندر چھُپی ہوئی سچائی کی تلخیاں ان کے دل کو چھیدنے لگیں۔ منزل اب بھی دور تھی، پاؤں تھکن سے چور تھے، حوصلہ پست تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے خیال سے پرانے برگد کی زمین پر پھیلی ہوئی ایک موٹی جڑ پر گردن جھکا کر بیٹھ گئے، اور ماضی کی طرف تیزی سے دوڑ پڑے۔

دو ماہ پہلے بیٹیا کے بلاوے کا تار پاکر ان کی زندگی کے نصف سوکھے درخت میں نئی کونپلیں پھوٹی تھیں۔ خوشی سے سرشار ہو کر انھوں نے ساتھیوں کو تار دکھایا تھا، بیوی کی قبر پر جا کر دعائے مغفرت کرنے کے بعد اپنے جذبات سے بے قابو ہو کر بول اُٹھے تھے۔

"مَیں تم سے بار بار کہا کرتا تھا کہ اپنا دل چھوٹا نہ کرو، ہمارے بیٹے کے جسم سے ہمارا خاندانی خون ہرگز زائل نہ ہوگا، خواہ وہ دنیا کے کسی خطّے میں کیوں نہ رہے۔ اور وہاں کا ماحول جیسا بھی ہو۔ لوٹ کر اعلیٰ منصب پائے گا، اور ہمارے آخری دن سُکھ چَین سے

گذریں گے — لیکن تم پریشانیوں سے تنگ آ کر ہمت ہار بیٹھی — اور میرا ساتھ چھوڑ دیا — کاش کہ آج تم زندہ ہوتیں — ؟"

بیٹا کے بنگلہ میں پہنچ کر انھوں نے کیا سوچا اور کیا پایا — یہ حقیقت جب ان کے ذہن میں اُبھری تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں — ایک دن ان کی بہو اور اس کی سہیلیاں رمی کھیل رہی تھیں اور قہقہوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے — وہ مغربی تہذیب و تمدن میں پھیلی ہوئی گندگی کو مشرقی معاشرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر چُپ نہ رہ سکے تھے، اور انھوں نے ملازم رجب میاں سے بہو کو بلوا کر بڑی نرمی سے کہا تھا —

"دُلہن — اچھے گھرانوں میں یہ سب کھیل پسند نہیں کیا جاتا ہے —"

اتنا کہنا تھا کہ جیسے پیال کے ڈھیر میں آگ لگ گئی ہو — لہکتی ہوئی ان کی بہو نے بڑا تلخ جواب دیا —

"آپ کو دو وقت کی روٹیاں چاہیے — وہ ملتی رہیں گی — لیکن آپ دخل اندازی سے گریز کیا کریں — میں آپ کے بیٹے کی زر خرید باندی نہیں ہوں —"

فیاض صاحب ہکا بکا ہو کر رہ گئے تھے — اس واقعہ کے بعد کوئی دن ایسا نہیں گذرا، جب وہ بہو کی طنز بھری باتوں کا شکار نہ ہوئے ہوں — اپنے بیٹے کی زندگی سنوارنے کی خاطر انھوں نے قربانیاں دی تھیں — اثاثوں کو بیچ کر تنگ دستی خریدی تھی — اپنی شریکِ حیات کو کھویا تھا — سب کچھ گنوا کر اپنے بیٹے کی زندگی میں دُکھ بھرنا کس طرح پسند کرتے ؟ — چاہت کی مانگ کچھ تھی — غیرت اس مانگ کی مخالف تھی — مزید ذلت کے خوف سے وہ بریف کیس میں اپنا ضروری سامان رکھ کر چپکے سے بنگلہ سے نکل پڑے تھے — فیاض صاحب کے ذہن میں سوچ کا مقید پرندہ ان کے دماغ کے پنجڑے سے نکل کر اُڑ گیا تو انھوں نے اپنی جُھکی ہوئی گردن اُٹھائی — دیکھا کہ ایک سفید پوش سن رسیدہ آدمی ان کے سامنے سے گذر کر دو قدم آگے بڑھا، پل بھر رُکا — پھر پلٹ کر ان کے پاس آیا، اور شک و شبہ میں پڑا دبے لہجے میں پوچھا —

"آپ بڑے ناظر صاحب تو نہیں ___؟"

"کبھی تھا بھائی ___ اب نہیں ہوں ___"

وہ اپنے دفتر کے چپراسی مُرلی دھر کو پہچان گئے تھے ___ لیکن انھوں نے اپنے خون میں لگاؤ کا جب کوئی جذبہ نہیں پایا تھا تو پرائے خون میں پانے کی اُمید کیوں کرتے ___؟

"شاید آپ مجھے پہچان نہیں پائے ___ مَیں مرلی دھر ہوں آپ کا سیوک ___ اپنی زندگی کی آخری ہچکی تک آپ کی مہربانیاں بھول نہیں پاؤں گا ___ مالکن کہاں ہیں ___؟" مرلی دھر نے ان کے قریب بیٹھ کر پوچھا ___

"غموں سے تنگ آکر انھوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ___ اور مٹّی کے اندر سکون سے سو گئیں۔"

دل کے درد سے فیاض صاحب کی آواز بھاری ہو گئی ___

"اور چھوٹے بابو ___؟" مرلی دھر نے پوچھا ___

"ان کے بارے میں کوئی سوال دوبارہ مت کرنا مُرلی ___ ہو سکتا ہے کہ میرے دل میں لگے زخم کے تمام ٹانکے تڑ تڑا کر ٹوٹ جائیں ___ اور میں زندہ نہ رہ پاؤں ___"

اور فیاض صاحب کے چہرے پر دل کی اُداسیاں پھیل گئیں ___

"ایک بھائی تو ابھی آپ کا زندہ ہے ___" مرلی دھر کی نگاہیں فیاض صاحب پر جمی تھیں ___

"میرا بھائی ___؟" فیاض صاحب کی آواز میں حیرت تھی ___

"ہاں ___ آپ کا بھائی مُرلی ___"

یکایک دونوں کھڑے ہو گئے ___ اور مُرلی نے پوری طاقت سے انھیں اپنی باہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا ___

"چلیے بھائی ___ میرے گھر ___" مرلی دھر نے بریف کیس اٹھالیا اور فیاض صاحب مرلی دھر کے ساتھ چلتے رہے ___ باتیں ہوتی رہیں ___ راستہ طے ہوتا رہا ___ مرلی دھر نے اپنے مکان کے سائبان میں پہنچ کر تیز آواز لگائی ___

"آمر کی ماں جلدی آ ___ دیکھ کون آئے ہیں ___ بھگوان نے تیری اِچھا پوری کر دی ___"

مرلی کی بیوی شانتی اپنے شوہر کی ملازمت کے دوران اپنی مجبوریوں سے نجات پانے کی خاطر کئی بار فیاض صاحب سے مل چکی تھی ___ اور کبھی نامراد نہیں لوٹی تھی ___ وہ ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی باہر آئی اور فیاض صاحب کو دیکھ کر خوشی سے ہاتھ جوڑ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ___

"شانتی ___، اب بھیا کو اندر لے چلے گی یا ہاتھ جوڑے چُپ کھڑی رہے گی ___" مرلی نے کہا ___

"آج میرا گھر سورگ بن گیا ___" شانتی نے کہا ___

فیاض صاحب اپنے اور پرائے کے درمیانی فرق کو دیکھ کر سخت حیران تھے ___ جو اپنوں میں نہیں پایا تھا وہ پرائے دے رہے تھے ___، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جو ہمیں خلوص دے، صحیح معنوں میں وہی اپنا کہے جانے کا حق دار ہے، باقی سب پرائے ہیں ___ رشتہ ناطہ، خون اور خاندان یہ ساری باتیں بکواس، لغو اور خود فریبی کے سوا کچھ بھی نہیں ___، ایک مکڑی کی جال کی طرح ہیں جو مفاد کے تقاضوں کے تحت پھیلتے اور سکڑتے ہیں ___، ہمارے سماج میں اپنے اور پرائے کہے جانے کا چلن کیوں مروج ہوا ___؟ مرلی کی عمر نے اس کو طرح طرح کے تجربوں کے رازوں سے واقف کیا تھا ___، فیاض صاحب کی خاموشی دیکھ کر فوراً سمجھ گیا کہ وہ کسی کش مکش سے دوچار ہیں ___، ان کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھوں کا ہلکا دباؤ ڈال کر انھیں صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا ___

"آپ اپنے گھر آ گئے ہیں ___ اجازت دیں تو بہو کو بلاؤں ___؟ آپ اپنی بہو سے ملنا چاہیں گے ___؟"

"امر کی دُلہن ___؟" فیاض صاحب کا حافظہ قابلِ رشک تھا، اتنے دنوں کے بعد بھی وہ امر جو اسکول جاتے وقت آپ کا کھانا لے جاتا تھا اور جس کو آپ روزانہ ایک روپیہ دے کر سمجھاتے تھے کہ دو گھنٹہ صبح و شام پڑھنے کی عادت بنا لو تو یقیناً ایک نہ ایک دن تم اپنے باپ کا نام روشن کرو گے"

فیاض صاحب نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا ___

"امر کرتا کیا ہے ___؟"

"وہ اس شہر کا ایس پی ہے ___"

فیاض صاحب کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔۔ بے اختیار ہوتے ہوئے بولے ۔۔

" بلاؤ بہو کو ۔۔"

چند ساعت کے اندر گھونگھٹ میں چہرہ چھپائے، مشرقی تہذیب کی پوری حفاظت کرتی ہوئی امر کی بیوی نے جھک کر فیاض صاحب کے چرن چھوئے اور اٹھ کر اپنے ہاتھوں کو جوڑ کر کھڑی ہوگئی ۔۔

فیاض صاحب خوشی سے پھٹ پڑے ۔۔ اپنے کرتے کی جیب سے دس روپے نکالے، اور انتہائی دبی ہوئی آواز میں بولے ۔۔

" میری خوشی کے لیے یہ حقیر رقم قبول کرلو بہو ۔۔"

بہت ہی اپنایت سے بہو نے کہا ۔۔ " باوجی، یہ دس روپے نہیں، میرے لیے دس لاکھ ہیں ۔۔ بھگوان کی مورتی کے سامنے جس مہاپُرش کی ٹنگی ہوئی تصویر ہے، اُن کا درشن ہوجانا کیا یہ میری سب سے بڑی خوش قسمتی نہیں ۔۔ ؟"

" جُگ جُگ جیو بہو ۔۔ اس حقیر بوڑھے کو عزت تم نے بخشی ہے ۔۔ خدا تمھیں اس کا صلہ ضرور دے گا ۔۔"

فیاض صاحب کے دل میں جذبات کا سیلاب آگیا تھا ۔۔

ایک گھنٹہ بھی نہیں گذرا تھا کہ امر کی جیپ دروازہ پر لگی ۔۔ شاید اس کی بیوی نے فون سے اطلاع دی ہو ۔۔ وہ تیزی سے لپکتا ہوا فیاض صاحب کے قریب پہنچ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ کو جوڑ کر بولا ۔۔

" بھگوان نے آپ کا درشن کرادیا ۔۔"

فیاض صاحب نے امر کو اپنے قریب بٹھا کر اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا ۔۔

" بیٹے میری بات پر عمل کر کے اس کا پھل تم نے پالیا ۔۔ ایک اہم نکتے کی بات پھر تم سے کہہ رہا ہوں ۔۔ غریب طبقوں کے حقوق کی پوری طرح سے حفاظت کرنا ۔۔ اور ایسے افراد جو اپنے ہاتھوں غنڈوں اور دھن کے بل سے قانون اور انصاف کو اپنے حق میں کر لینے کے عادی ہوتے جارہے ہیں، بے خوف ہو کر ان کے گریبانوں پر ہاتھ ڈال دینا ۔۔ ممکن ہے اس راہ کو

اپنانے میں تمھیں قدم قدم پر اڑچنیں پیش آئیں ـــ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے ـ لیکن تم نراش ہرگز نہ ہونا ـ فتح یقیناً تمھاری ہوگی ـ کیوں کہ سچائی کو مکر و فریب کی چادر سے زیادہ دنوں تک چھپایا نہیں جا سکتا ـ"

امر نے اپنا ہاتھ فیاض صاحب کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا ـ

"میں وچن دیتا ہوں چاچا کہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر آپ کی باتوں پر پوری طرح عمل کروں گا ـ"

پرایوں کے درمیان رہ کر فیاض صاحب اتنا خوش تھے جیسے کہ پوری کائنات ان کی مٹھی میں بند ہو ـ مُرلی کے خاندان کے تمام افراد ان کی عزت و احترام کرتے تھے ـ ایک دن آفس سے آتے ہی امر نے ان سے کہا ـ

"آج چھوٹے بابو سے ملاقات ہوئی تھی ـ" امر کی نگاہیں فیاض صاحب کے چہرے پر اپنی باتوں کے اثرات تلاش کرنے لگیں ـ

فیاض صاحب تالاب کے پانی کی طرح ساکت رہے ـ نہ ان کے چہرے پر دل کا کوئی عکس ابھرا ـ اور نہ ان کی زبان میں کوئی جنبش ہوئی ـ

" چاچا ـ کیا آپ مانتے ہیں ـ ؟ کہ کبھی کبھی ہم حقیقت جان نہیں پاتے اور غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں ـ" امر نے کہا ـ

"ہاں ـ ایسے حادثات اکثر ہوتے رہتے ہیں ـ" فیاض صاحب نے مختصر جواب دیا ـ

"بالکل ایسے ہی حادثہ کے شکار آپ بھی ہوئے ہیں ـ چھوٹے بابو کی دکھ بھری کہانی سن کر میں بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں ـ اپنی تعلیم کے آخری سال میں طویل علالت کی وجہ سے وہ امتحان میں نہ دے سکے تھے ـ مزید ایک سال کا قیام ضروری تھا ـ آپ کی دی ہوئی ساری رقم علاج میں صرف ہو چکی تھی ـ آپ کے پاس کچھ بچا نہ تھا ـ اس راز سے وہ واقف تھے ، آپ کو صحیح حالات سے آگاہ کرنا پاگل پن کے سوا کیا ہوتا ـ چھوٹے بابو نے انتہائی ضبط اور دانائی سے کام لے کر چپکی سادھ لی تھی ـ روتے تھے ـ رات رات بھر سو نہیں پاتے تھے ـ عارضی ملازمت پانے کے لیے ان کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں ـ اسی دوران ایک ہندوستانی

کلاس میٹ نے اس شرط کے ساتھ ان کی کفالت کرنے کی پیش کش کی تھی کہ امتحان ختم ہوتے ہی ان سے شادی کرلینی ہوگی ــــ ان کا مستقبل اندھیروں میں پھنسا ہوا تھا ــــ اور اُجالا پانے کی خاطر وہ راضی ہو گئے تھے ــــ" امر نے انکشاف کیا ــــ

فیاض صاحب کے دل میں باپ کی محبت نے جوش مارا ــــ اور وہ اضطرابی کیفیت میں بولے۔

"بیٹا امر ــــ تم مجھے اس کے پاس جلد لے چلو ــــ" فیاض صاحب کے دل میں اَن دیکھے جذبات نے شور مچا دیا تھا ــــ

"چاچا ــــ، ہم دونوں ناشتہ کرلیں ــــ، پھر چلتے ہیں ــــ"

وہ دونوں ناشتہ سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی لگاتار بجنے لگی، مجبور ہو کر امر نے اٹھ کر ریسیور اٹھالیا ــــ، وہ جیسے جیسے کچھ سنتا رہا اس کے چہرے کا رنگ زرد ہوتا گیا ــــ ریسیور رکھ کر جلدی سے فیاض صاحب کے قریب آکر بولا ــــ

"ہمیں فوراً چھوٹے بابو کے یہاں چلنا پڑے گا ــــ"

"خیریت تو ہے نا ــــ؟ جلدی کہو کیا بات ہے امر ــــ؟" فیاض صاحب بوکھلا گئے۔

"وہ پوری طرح ٹھیک ہیں ــــ، آپ ذرا بھی پریشان نہ ہوں ــــ" امر نے انھیں تسلی دی۔

جب وہ دونوں چھوٹے بابو کے بنگلہ کے بڑے ہال میں داخل ہوئے تو وہاں کا منظر بڑا دل شکن تھا ــــ، چھوٹے بابو پولیس کے گھیراؤ میں خاموش بیٹھے تھے ــــ، چھوٹے بابو کی بیگم کی لاش خون سے لت پت ہال کے وسط میں پڑی تھی اور اس کے دائیں ہاتھ کی گرفت میں ریوالور تھا۔

فیاض صاحب رجب کے پاس گئے، اور اس سے پوچھا ــــ

"یہ سب کیسے ہو گیا رجب ــــ؟"

سہمے ہوئے رجب نے پہلے چاروں طرف دیکھا ــــ، پھر دھیمی آواز میں کہنے لگا ــــ

"وہ بابو، جو ابھی آپ کے ساتھ آئے ہیں ــــ، صبح بھی آئے تھے ــــ، اس وقت بنگلہ میں نہ صاحب تھے اور نہ میم صاحبہ ــــ انھوں نے بڑی چالاکی سے ہنستے ہنساتے مجھ سے وہ بھید اُگلوا لیا جس سے تنگ آکر آپ یہاں سے چپکے سے نکل پڑے تھے ــــ، صاحب کے آنے کے بعد

دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے ـــ پھر وہ بابو وہاں سے چل دیئے ـــ میم صاحبہ جوں ہی اندر داخل ہوئیں، صاحب نے تڑاتڑ طمانچوں سے ان کے گالوں کو سُرخ کر دیا۔ یکایک وہ غصہ سے بپھر اٹھی تھیں ـــ، بڑی پھرتی سے انھوں نے اپنے پرس سے ریوالور نکال کر دو گولیاں صاحب پر چلائیں ـــ لیکن دونوں بار صاحب بڑی تیزی سے جُھک گئے تھے ـــ اور گولیاں دیوار سے ٹکرائی تھیں ـــ، تیسری گولی چلنے سے پہلے صاحب نے اچھل کر میم صاحبہ کی کلائی پکڑ لی تھی اور ریوالور کا رُخ ان کی طرف مُڑ گیا تھا ـــ ریوالور کا ٹریگر کس کی اُنگلی سے دبا تھا یہ خدا جانے ـــ؟"

انجام کے خوف سے فیاض صاحب گم سم کھڑے تھے ـــ، اسی وقت امر نے فیاض صاحب کے قریب آکر کہا ـــ

"آپ ذرا بھی چنتا نہ کریں چاچا ـــ"

فیاض صاحب بے اختیار ہو کر امر سے چمٹ گئے ـــ، ان کی آنکھوں سے ٹپکی ہوئی آنسوؤں کی بوندیں اعتراف کر رہی تھیں کہ ـــ رشتہ ناطہ، مذہب اور خاندان ـــ سب دنیاوی باتیں ہیں ـــ، جو وقت پر ساتھ دیتے ہیں وہ اپنے ہیں، باقی سب پرائے ـــ!

□□□

خاموش نگاہیں

لال بہادر شاستری اکادمی مسوری سے ٹریننگ لے کر واپس آیا تو میری غیر موجودگی میں آئے ہوئے خطوط کے انبار میں مجھے وہ تار بھی ملا جس کو پڑھتے ہی میرا دماغ گردش میں آگیا۔

یکایک آنکھوں میں تیرگی پھیلی ـــ دل میں اُٹھتی ہوئی یادوں کی یورش اس قدر طوفان خیز تھی کہ آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا ہر بندش کو توڑتا ہوا بہنے لگا، نہ جانے کب تک میں خود پر قابو نہ پا سکا تھا ـــ، مجھے معلوم نہیں ـــ کیوں کہ اچانک جو کچھ مجھ پر گذرا تھا اس نے میرے وجود کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا ـــ، رشتہ کا مضبوط بندھن ہم دونوں کے درمیان یقیناً قائم تھا ـــ، لیکن ان میں جذباتی لگاؤ کہیں بھی چھپا نہ تھا، بستر پر لیٹے لیٹے جب ذہن میں ٹھہراؤ پیدا ہوا تو سکون نے میرے دل و دماغ پر اپنے جذب اثرات کا دباؤ ڈالنا شروع کیا اور لاشعوری طور پر میرا دماغ یادوں کے ہچکولوں میں ڈولنے لگا ـــ

برسوں پرانی بات ہے ـــ جب میں اسکول کی تعلیم مکمل کر کے گاؤں کی مٹی سے نکلتی ہوئی سوندھی سوندھی سی خوشبو کے ماحول سے باہر شہر میں اپنے بڑے ابا کے سرکاری رہائش گاہ میں آیا تھا، میرے گاؤں کے گھر کے ماحول سے یہاں کا ماحول مختلف تھا ـــ، وہاں غربت کا حال پوری طرح نمایاں تھا، کیونکہ ابا مرحوم کی وفات کے بعد ہم دو بھائیوں اور بیوہ ماں کے رزق کا ذریعہ چند بیگھہ

زمین کی کاشت تھی، اور بڑے ابا کی شفقتوں کا سہارا تھا۔ اس کے برعکس ان کا طرزِ زندگی معیاری تھا۔ اچھے عہدے پر وہ فائز تھے۔ آرام و تسکینِ دل کے لیے ان کی قیام گاہ پر ساری چیزیں خدا نے انھیں بخشی تھیں اور قدرت ان پر اتنی مہربان تھی کہ دولت کا انبار عطا کرنے کے بعد بھی صرف ایک لڑکی پرورش ان کے سپرد کی تھی، جہاں ان کی پوسٹنگ تھی، وہ ڈویژن کی سطح کا چھوٹا سا شہر تھا۔ اسکول گرچہ وہاں کئی تھے، لیکن کالج صرف ایک تھا۔ اسی سال ان کی لڑکی ثنا نے بھی میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں امتیازی شان سے پاس کیا تھا، کالج میں جب اس کے داخلہ کا سوال اٹھا تو بڑے ابا نے اس کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے علی گڑھ یا دلی کا انتخاب کیا، لیکن بڑی امی اپنی بیٹی کو دل میں اٹھتی ہوئی چاہت کے دباؤ سے اپنی نگاہوں سے دور کرنے پر رضامند نہ ہوئیں۔ کئی دنوں تک گھر کے خوش گوار ماحول میں کھنچاؤ نے سکون کا پردہ ڈال دیا۔ میرا داخلہ تو میرے آنے کے بعد دوسرے ہی دن اس واحد کالج میں ہو گیا تھا لیکن ثنا کے داخلے کا مسئلہ بڑی امی اور بڑے ابا کے فیصلے کے درمیان پوری طرح اٹکا ہوا تھا۔ بڑے ابا مخلوط تعلیم کے برے اثرات قبول کر لینے کے خدشات سے ذہنی الجھنوں میں جکڑے تھے۔ تعطل کے جال میں کہیں شگاف پڑتے ہوئے نہ دیکھ کر بڑی امی نے اپنے پختہ ارادہ کا اظہار کرتے ہوئے صاف صاف بڑے ابا سے کہہ دیا کہ ثنا خواہ آگے تعلیم حاصل کرے یا نہ کرے، میں اپنی رضا سے ثنا کو اپنی نگاہوں سے کہیں دور جانے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گی، ویسے آپ مالک ہیں میں آپ کی کنیز ہوں، آپ کا حکم ماننا میرا فرض ہے۔ ثنا اگر چلی جائے گی تو بہت ممکن ہے کہ میرے دل کا مرض ابھر آئے، اور میں زندہ نہ رہ سکوں۔ بڑے ابا چند منٹوں تک چپ رہے پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ثنا کو کالج لے جانے اور لانے اور کالج کے حدود میں اس کی دیکھ ریکھ کی تمام ذمہ داریاں تم قبول کر لو تو آج ہی اس کا داخلہ کرا دوں۔

کئی دنوں سے گھر کا ماحول میں جو سونا پن برقرار تھا وہ بڑی امی کے ہونٹوں پر بے اختیار ہو کر آئی ہوئی مسکراہٹوں نے نیا رنگ پھیلا دیا۔ ثنا کی بھی گرچہ اپنی خواہش تھی۔ لیکن والد کے احترام نے لب کشائی کی ہمت اس کو بخش نہ پائی تھی اور میرا وجود تو بڑے ابا کے کرم کا محتاج تھا۔ اس وجہ سے

میرے دل کے آنگن میں نہ کوئی چھاؤں تھی — نہ دھ ب — گوشت کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا جس کی دھڑکن زندگی کی علامت ہوتی ہے — اور جس میں وقتی اور لمحاتی تقاضوں سے ہزاروں خواہش ابھرتی اور فنا ہوتی ہیں — وہ پوری طرح تمام جذبوں اور خواہشوں سے خالی تھا —

ایام تعلیم کے طویل سفر کے دوران ہم دونوں کے درمیان حجاب کا دبیز پردہ حائل رہا — وہ بے حد کم سخن، سنجیدہ مزاج اور غیر موزوں بات کرنے سے گریز کرتی تھی — اس وجہ سے ہم دونوں جو باتیں کرتے تھے وہ بھی درس و تدریس کے متعلق ہوتی تھیں — گھر میں بھی وہ بے تکلفی پر کبھی آمادۂ خاطر نہ ہوتی تھی، کالج اور گھر کے علاوہ ہم دونوں نہ کبھی ساتھ شاپنگ، سنیما اور نہ سیر و تفریح کے لیے کہیں گئے تھے — کبھی کبھار ایسا ضرور ہوا تھا جب کبھی وہ کوئی منطق کی گرہ سلجھا نہ پائی تھی تو میرے کمرے میں آکر پہروں اس گتھی کو سلجھانے میں میرے دماغ کی چولیں ہلا دیا کرتی تھی — اس کا کوئی رویہ — طرز تکلم کا کوئی اندازہ — اُٹھنے بیٹھنے کا کوئی ڈھنگ مجھے کبھی ایسا نظر نہیں آیا جس سے میں اپنے لیے کوئی خوش فہم معنی اخذ کرتا — اور اس کے اس رویہ کا ردعمل تھا کہ میرا کردار بھی اپنی عظمت سے لڑھک کر اس کی خلائی آنکھوں میں جھانکنے پر آمادہ نہ ہوا تھا — لیکن اس حقیقت سے بھی میرا ضمیر انحراف کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اس کی عادت کی پاکیزگی — جیسے رہنے کے سلیقے کے تقدس نے اکثر مجھے اس کے متعلق سوچنے پر مجبور کیا تھا — لیکن سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے موتی پالینا ہر کے مقدر کی بات نہیں ہوتی — اور یہ سچائی اتنی ٹھوس تھی کہ میرے دل میں اٹھتے ہوئے ولولوں کی یورش خود بہ خود سرد ہو کر دل کے خانوں میں منجمد ہو جاتی تھیں — میں نے اکثر رات کی تنہائی میں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے تنکوں کی طرح جوڑ جوڑ کر اپنے حوصلوں مضبوط بنایا تھا کہ اگلی صبح جب ثنا چائے دینے آئے گی تو تہذیب کے دائرہ میں رہ کر کوئی ایسی بات کا اظہار کر دوں گا جس سے بے ساختہ ہو کر وہ اپنے دل میں چھپے ہوئے جذبوں کو دبا نہیں پائے گی — لیکن جب بھی وہ میرے سامنے آتی تھی ہمیشہ اس کی نگاہیں جھکی رہتی تھیں — اور اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے حجاب کی پاکیزگی کو دیکھ کر میری قوت گویائی سلب ہو جاتی تھی اور ہم دونوں کے درمیان ایک دوسرے کے لیے کوئی ظاہری جھجکا دُپیدا نہ ہو سکا تھا — ممکن ہے کہ میرے دل کی چاہت کی طرح اس کے دل

کی بھی کچھ آرزو ہو یا یہ صرف میری چاہت کے وہم کی ایک کڑی ہو، کیوں کہ ظاہری حالات میں کئی سالوں کے بعد بھی کوئی ایسا تغیر ابھر کر سامنے نہیں آیا تھا جس سے کہ حسین سپنے خود جاگ اٹھتے، اور آرزوئیں جگمگانے لگتیں۔ یعنی ابتدائی دور میں میرے اور ثنا کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ کئی برسوں کے گذر جانے کے بعد بھی جوں کا توں برقرار تھا۔ ندی کے دو پاٹ کی طرح ہم دونوں دو کنارے تھے اور بیچ میں ساکت پانی تھا۔ جس کے اندر چھپی ہوئی موجیں تھیں۔ بھاگتے ہوئے وقت کے ساتھ ہم دونوں جب بی۔ اے کا امتحان امتیازی شان سے پاس کر گئے تو ثنا کی ہتھیلیوں کو مہندی سے سرخ کرنے کی باتیں گھر میں زور و شور سے ہونے لگیں۔ بڑے ابا کی نظر انتخاب میری طرف تھی، مگر بڑی امی میرے گھر کے افلاس سے پوری طرح واقف تھیں۔ ان سے یہ راز بھی پوشیدہ نہ تھا کہ بڑے ابا وقتاً فوقتاً میرے گھر کی عزت سنبھالے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے بڑی امی ثنا کے لیے ایسے گھرانے کی تلاش میں سرگرداں تھیں جہاں ثنا کو مالی تنگی پیش آنے کا امکان نہ ہو۔ دولت کی کشش سے دولت چمٹتی ہے۔ یہ کہاوت عام ہے۔ سچائی کا اس کہاوت سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ بڑے ابا نے بڑی امی کی خواہشات سے مجبور ہو کر اپنی آرزو کا گلا دبا دیا۔ اور میرے دل کے اندر کی چنگاری حالات کی راکھ میں دب گئی۔ ثنا کی شادی کے موقع پر میرے دل کا کرب میرے وجود کو گرچہ اپنے حصار میں لیے تھا پھر بھی میں نے وہ تمام احکامات انجام دیئے جو میرے سپرد کیے گئے تھے۔ ہر برقی قمقمے کی روشنی میں میرے دل کے اندر کا اندھیرا جذب تھا۔ لیکن میرے ظاہری رویّہ سے میرے دل کے اندر پنہاں کرب کو کوئی سمجھ نہیں پایا ہوگا۔ اس کی رخصتی کے چند دنوں بعد بڑے ابا کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر کے میں دلّی پہنچ گیا اور آئی۔ اے۔ ایس (IAS) کے امتحان میں شریک ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ افلاس کے جرم میں جو سزا مجھے ملی تھی اس کی پاداش میں ثنا کو کھو چکا تھا۔ یہ سوچ میرے لیے اتنی تکلیف دہ تھی جس نے میرے وجود میں ایسا شعلہ لہکا دیا تھا۔ جو مجھے اونچا مقام حاصل کرنے کے لیے ہر پل اکساتا رہا۔ اور قدرت بھی یقیناً ان پر مہربان ہوتی ہے جو اپنے ارادے کی پختگی کے ساتھ کچھ حاصل کرنے کی ٹھان لیتے ہیں۔

رات دن کی میری کاوشیں رنگ لائیں اور آئی اے ایس کے نتیجے کی فہرست جو اخبارات میں اشاعت پذیر ہوئی ان میں میرا نام سر فہرست تھا، تقرری کے بعد مجھے مزید ٹریننگ کے لیے مسوری بھیج دیا گیا، وہاں میرے قیام کے دوران تقریباً ہر دو چار دن کے بعد مجھے ماں کا پیار بھرا خط ملنے لگا ــــ کہ کب میں گھر لوٹ رہا ہوں ــــ میری شادی کے لیے ایک سے ایک صاحب ضرورت اور عزت دار گھرانوں سے رشتے آ رہے ہیں ــــ خوب صورت تعلیم یافتہ لڑکیوں کی تصویروں کا ایک انبار سا میرے پاس جمع ہو گیا ہے ــــ لیکن ان کے ہر خط کا جواب میں اس اہم نکتہ کے متعلق کچھ لکھتی ہی نہیں تھیں ــــ لکھتی بھی کیا ــــ میرے دل پر لگی گہری چوٹ کا درد اکثر میرے ذہن پر پھیل کر میری آنکھوں کو بھگا دیتا تھا ــــ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات کی ہوئی کہ ماں نے اتنی اہم خبر مجھ سے چھپائی کیوں تھی، ان کا خط برابر مجھے ملتا رہا تھا ــــ یقیناً اس حادثے کا انھیں بھی علم ہوا ہوگا ــــ لیکن جب میں نے اس وجہ کے تمام پہلوؤں پر پوری طرح سنجیدگی سے غور کیا تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ماں نے سوچا ہوگا کہ اس خبر سے لازمی طور پر میرے دل و دماغ پر شدید جھٹکا لگتا اور اس کا ردعمل پریشان کن بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ سوچ کی اس گہرائی تک پہنچتے ہی ماں کی دور اندیشی مجھے حق پر مبنی نظر آئی ــــ بڑے ابا کے طویل خط کے ہر لفظ سے ان کے دل سے رستا ہوا لہو ٹپک رہا تھا ــــ ثنا کا شوہر وقار اپنی کوئی بھی جیتی جاگتی ہوئی نشانی اس کی گود کو بخشے بغیر ایک کار حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ اور ثنا جو سرخ جوڑا پہن کر سسرال رخصت ہوئی تھی، عدت کے ایام گذار کر سفید لباس میں گھر واپس لوٹ آئی تھی ــــ

اسی دن میں شام کی ٹرین سے تعزیت کے لیے روانہ ہو گیا ــــ ساری رات ثنا کے ساتھ گذرے ہوئے دنوں کی باتیں میرے ذہن کے پردے پر طرح طرح کی تصویریں ابھارتی رہیں ــــ اور نقش کا تاثر میرا دل جذب کرتا رہا ــــ میں بے چین اور مضطرب ہوتا رہا۔

اگلی صبح جب میں بڑے ابا کے قیام گاہ پر پہنچا تو انھوں نے مجھے دیکھتے ہی لپک کر اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا ــــ اور بے اختیار ہو کر رونے لگے ــــ ظاہر ہے کہ

ان کے درد کو سمجھ رہا تھا ۔۔ میرے دل میں بھی محبت کا بہاؤ اتنا تیز ہوا کہ میں بھی سسکنے لگا۔ انھیں اپنے تجربوں سے وقت کے تقاضوں کا احساس تھا ۔ مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے بولے ۔۔

"خدا کی رضا کے آگے انسان بے بس ہے اور اس کی مصلحت ۔۔ اس کے علاوہ کوئی جان نہیں سکتا بیٹا ۔۔"

اس وقت تک بڑی امی بھی ہمارے قریب آ چکی تھیں، ان کی آنکھیں بھی ساون کی طرح برس رہی تھیں ۔ لیکن ان کی آنکھیں بھی جھکی ہوئی تھیں، جیسے کہ انھوں نے کوئی جرم کیا ہو یا کوئی غلط اقدام کا پچھتاوا ان کے وجود کو پگھلا رہا ہو ۔۔

مَیں نے چھائی ہوئی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا ۔۔

"مَیں آپ دونوں کی موجودگی میں ثنا سے ملنے کا خواہش مند ہوں ۔۔"

ہم تینوں جب ثنا کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ پلنگ پر اُکڑوں اپنے ٹخنوں پر سر ڈالے بیٹھی ہوئی تھی ۔۔ بڑے ابا نے کہا ۔۔

"ثنا ۔۔ سر اُٹھاؤ ۔۔ دیکھو ۔۔ تم سے کون ملنے آیا ہے ۔۔"

اس نے جوں ہی ٹخنوں سے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا، میری نگاہیں تاڑ گئیں کہ اس کے جسم میں لرزہ سا طاری ہو گیا تھا ۔۔ وہ بالکل اسی طرح مجھے نظر آئی جس طرح مَیں نے اسے دیکھا تھا ۔ میرے جذبات کا باندھ جو کئی برسوں سے اخلاقی قدروں کی چٹانوں سے دبا ہوا تھا، یکایک ٹوٹ گیا ۔۔ اور مَیں نے بے اختیار ہو کر اپنے مضبوط ارادوں کے تحت اپنے ہاتھوں کا سائبہ ثنا کے سر پر ڈال دیا ۔۔ اپنے اس عمل کے بعد جب پلٹ کر مَیں نے بڑے ابا کو دیکھا تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں ۔۔ لیکن ان کے ہونٹوں پر دبی دبی خوشیوں کی مُسکراہٹ اُبھری ہوئی تھی ۔۔ !

□□□

سراب

جاوید اقبال نے اپنی بیوی ثمرین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کے چہرے کا بہ غور جائزہ لیا، اُداس اور پریشان چہرہ نے جاوید اقبال کے ذہن کو جھنجھوڑ دیا ۔۔۔ بے اختیار ہو کر بولا۔

"کیا ہوا ہے ثمرین ۔۔۔؟ تم اس قدر اداس اور فکر مند کیوں ہو ۔۔۔؟ بچوں کے خطوط بھی کل ہی آئے ہیں، سب مزے میں ہیں، کوئی انہونی بات ہوئی بھی نہیں ۔۔۔ پھر یہ فکر کی پرچھائیاں تمہارے چہرے پر کیوں ۔۔۔؟ کیا بات ہے ۔۔۔؟ مجھے نہیں بتاؤ گی ۔۔۔؟ اکیلی تم تو نہیں ہو ۔۔۔ میں تمہارے سُکھ دُکھ کا ساتھی ہوں ۔۔۔ پریشانیاں بانٹ لی جائیں تو ہلکی ہو جاتی ہیں ۔۔۔ تم اکیلی اپنی الجھنوں سے کیوں اُلجھ رہی ہو ۔۔۔ چلو اندر بیٹھتے ہیں ۔۔۔"

جاوید اقبال کے لہجے میں اتنا اپنا پن بھرا تھا کہ ثمرین ان کا ہاتھ تھامے اندر آ گئیں، وہ وجہ ظاہر کر کے اپنے شوہر کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں، اس لیے طبیعت کی کسل مندی اور تھکن کی باتیں بنا کر اپنے کمرے میں چلی آئیں ۔۔۔ بستر پہ لیٹتے ہی جہاں وہ پلک جھپکتے ہی نیند کے ساگر میں ڈوب جاتی تھیں، آج ان کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا ۔۔۔ دماغ میں طوفانی ہلچل مچی تھی اور دل بے چین تھا ۔۔۔ وہ جہاں رہتی تھیں وہ اُمرا کی کالونی تھی ۔۔۔ ہر طرف خوش حالی تھی ۔۔۔ دور کالونی سے الگ جھونپڑیاں بسی تھیں، جس میں زندگی گذارنے والی عورتیں

کالونی کے اندر کام کرنے آتی تھیں ___

ثمرین کو شروع سے ہی زیادہ گھومنے کا شوق نہیں تھا، وہ اپنے فرصت کے اوقات اپنی گھریلو زندگی کی خوشیوں کے بیچ گذارتی تھیں ___، چاہنے والا شوہر ملا تھا اور پیار کرنے والے تین بچے، زندگی کی اُلجھنوں اور پریشانیوں کا سامنا صرف چند بار انھوں نے کیا تھا اور وہ اُلجھنیں وہی تھیں جو ایک عام عورت کو اپنی گھریلو زندگی میں ہوتی ہیں ___، لیکن آج اپنے یہاں کام کرنے والی شوبھا کی باتوں کو سن کر انھیں اپنی دادی کی بات ذہن میں گھومنے لگی تھی ___

"عورت بڑی بد نصیب ہوتی ہے ___، ماں لڑکی کو جنم تو دے سکتی ہے ___ لیکن تقدیر نہیں دے سکتی ___، عورت اپنی تقدیر میں بد نصیبی جنم سے ہی لکھوا کر لاتی ہے، یہ اور بات ہے کہ بد نصیبی کئی حصّوں میں بٹ جاتی ہے ___ اور وقت اور حالات کے تحت وار کرتی رہتی ہے۔"

دادی کی باتیں پہلے انھیں دقیانوسی لگتی تھیں ___، انھوں نے اپنے ماں باپ، بھائی بہن کا بھرپور پیار پایا تھا ___ اور جب بیاہ کر سسرال آئیں تو انھیں ایسا لگا کہ جنت صرف آسمان پر ہی نہیں دنیا میں بھی ہے ___ اور وہ جنت بسی ہے شوہر کے گھر میں ___، شوہر کا بھرپور پیار اور پیارے پیارے بچوں کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داریوں نے ماں باپ سے جدائی کے غم کو بھی بھلا دیا تھا ___ وقت نے کئی کروٹ بدلے ___، زندگی میں کئی اُتار چڑھاؤ آئے اور انھیں جتنی خدا سے اپنی دعاؤں کے اثر اور قبولیت کا یقین تھا ___ اتنا ہی اپنے شوہر کے پیار کا بھروسہ بھی تھا ___ زندگی کے ہر موڑ پر ان کے شوہر ان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رہے ___ وقت اُڑتا ہوا ہواؤں کی طرح گذرتا چلا گیا ___، اپنی جوان بچوں کو سونپ کر ان کی تمام ذمّے داریوں سے خود کو نجات دلا کر سکون سے جی رہی تھیں ___، لیکن آج کام کرنے والی شوبھا کی باتوں نے انھیں سوچنے پر مجبور کر دیا ___، انھوں نے پہلے سوچا بھی نہیں تھا کہ دنیا میں دوسری عورتیں کس طرح جیتی رہتی ہیں ___ اس سوچ کے بیچ انھیں بچپن کی باتیں بھی یاد آنے لگیں ___، انھوں نے اپنے پاس پڑوس میں بسنے والی عورتوں کی اکثر بھیگی ہوئی راتوں میں سسکیاں اور چیخیں سُنی تھیں ___، مَردوں کے عتاب کا شکار عورتیں ہوئی تھیں ___، جب ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا ___ ان کے ذہن میں تصویر

کا دھندلا سا عکس ضرور ابھرا تھا — لیکن سوال کا جواب نہیں — ایک تو بے شعوری کی عمر تھی۔ وہ ان سوالوں کا جواب کس سے اور کہاں سے طلب کرتی — گھر کا ماحول بھی ٹھیک ہی تھا، بس کبھی کبھی رات کو ماں کو روتے دیکھتی تھیں اور ان کے پوچھنے پر ان کی ماں کے سر کے درد کی بات کہہ کر انھیں ٹال گئی تھیں — پھر وقت بھاگتا گیا — بے شعوری عمر نے شعور دیا تو گھر کی دہلیز پار کر کے وہ ایک جنت میں آ بسی تھیں — زندگی کی ساری خوشیوں کو پانے کی دعائیں رخصتی کے وقت جو اُن کے ماں باپ نے دی تھیں وہ اُن دعاؤں کی چھاؤں میں زندگی گذار رہی تھیں۔ وہ اپنی عمر کی منزل کے ٹھہراؤ پر تھیں تو زندگی نے نیا رنگ دکھانا شروع کیا —

بچپن میں ذہن میں تصویروں کے جو ہلکے ہلکے عکس تھے — جو سوالات تھے — وہ واضح اور نمایاں ہونے لگے — عورت اپنی زندگی کے آخری دنوں کا انتظار اتنی شدت سے کرتی ہوئی ملے گی — ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا — شوبھا بھی ایک مظلوم عورت تھی — سترہ سال کی عمر میں وہ لڑکی بھی تھی اور عورت بھی — بھوک سے زرد چہرہ، بدن پر کپڑے کی شکل میں کئی جگہوں پر پیوند لگی میلی کچیلی سی ساڑی پہنے شروع میں جب وہ نئی نئی کام پر لگی تھی تو کچھ عجیب سا رویہ رکھتی تھی — کبھی تو بہت خوش دکھائی دیتی تھی اور کبھی معمولی سی بات پر رونا شروع کر دیتی تھی۔ جب انھوں نے اس رویہ کی وجہ پوچھی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلی ہے — اپنا کوئی نہیں ہے — بچپن میں ماں کے مرنے کے بعد باپ نے دوسری شادی کر لی، سوتیلی ماں کے ظلم کے سایے تلے اس کا بچپن نہ جانے کہاں کھو گیا — باپ شرابی تھا — بھائی بہن بھی کوئی نہیں تھا —

ایک رات سوتیلی ماں کے ظلم و ستم سے وہ فرار ہو گئی — اور ایک نئے شہر میں پہنچ گئی — نئی جگہ تھی — لوگ انجانے تھے — وہ جوان تھی — کہاں جاتی — کس کے نشیمن میں پناہ لیتی — عزت کے لُٹ جانے کا خطرہ لاحق تھا — ایک عمارت زیرِ تعمیر تھی، بہت سی مزدور عورتیں کام کر رہی تھیں — اس نے ایک کو اپنی کہانی سُنائی، اور اس کے ساتھ کام کرنے لگی — اسی مزدوری کرنے کے دنوں اس کی زندگی میں ایک لڑکا جھانکنے

لگا ۔ ' وہ پیار، ہمدردی اور سہارے کی بھوکی تھی ۔ ' اس نے اس کے اعتماد کے سہارے کو اپنا لیا ۔ ' اس نے شادی کر لینے کا وعدہ کیا ۔ ' دونوں مزدوری کرنے لگے ۔ ' ساتھ رہنے لگے ۔ ' اور ایک رات دونوں کے جواں جذبات نے تمام حدود کو توڑ ڈالا ۔ ' پھر بھی وہ پچھتاوے کی آگ میں نہیں سلگی ۔ ' اس کو پورا بھروسہ تھا کہ وہ ایفائے وعدہ ہر قیمت پر کرے گا ۔ ' لیکن ایسا ہوا نہیں ۔ ' اب نہ وہ کنواری رہی ۔ نہ بیاہی ۔ اور نہ بیوہ ۔ ' دھیرے دھیرے اس نے مزدوری پر جانا چھوڑ دیا ۔ اس کی زندگی تاریکیوں میں لپٹتی رہی ۔ مار کھاتی رہی لیکن فرار کی ہمت نہ کر سکی ۔ ' ثمرین کا دماغ چھن سے ہو گیا ۔ ' اس نے جب شوبھا سے کہا تھا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کیوں نہیں دیتی تو شوبھا نے زہر پیتے ہوئے کہا تھا ۔

" کیسے چھوڑوں مالکن ۔ ؟ کئی سال سے اس کے ساتھ بیوی کی طرح رہ رہی ہوں ۔ ' آس پاس کے سب لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ میرا آدمی ہے ۔ آج اس کو چھوڑ دوں گی تو کل ہر آدمی بھوکے بھیڑیئے کی طرح میری طرف دوڑ پڑے گا ۔ ' آج وہ پی کر مجھے مارتا ہے یا گالیاں دیتا ہے پھر بھی دوسرا کوئی مجھے نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا ہے ۔ ' وہ سمجھتا ہے کہ میں کسی کی بیوی ہوں ۔ لیکن اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے تو ہر رات کسی نہ کسی کی خالی تھالی کا کھانا بنتے بنتے اتنی جوٹھی ہو جاؤں گی کہ پھر وہی جب مجھے جوٹھی تھالی کا بچا ہوا کھانا سمجھ کر کچرے میں پھینک دیں گے اور کتے کے کھانے کے لیے چھوڑ دیں گے ۔ ' یہی سچائی سوچ کر اس کی مار سہتی ہوں ۔ ' آپ سب کے گھروں میں کام کر کے اس کا اور اپنا پیٹ پالتی ہوں ۔ ' کیا کروں ۔ ؟ ۔ اوپر والے نے نصیب ہی ایسی لکھی تھی ۔ "

اس کی باتیں سن کر ثمرین کو اس کے ماں باپ پر شدید غصہ آیا تھا ۔ ' وہ اس کی بدبختی جان کر اس کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھیں ۔ ' لیکن شوبھا ان پڑھ تھی ، پھر بھی انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شوبھا کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گی ۔ ' اس کی زندگی میں پھیلے ہوئے اندھیروں کو کسی نہ کسی طرح دور کر کے رہیں گی ۔ اس کی وجہ سے انھوں نے شوبھا سے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ وہ آج کے بعد روئے گی نہیں ۔ ' عورت کا جنم اس لیے نہیں ہوتا ہے کہ وہ

زندگی بھر ٹھوکریں کھائے صرف اس وجہ سے کہ وہ اکیلی اور بے سہارا ہوتی ہے — اپنی عزت کے بچاؤ کے لیے وہ صرف آدمی کے سہارے کی محتاج بنی رہے — عورت کا اپنا کیا ہوتا ہے؟ یہ سوچتے سوچتے ثمرین کا ذہن تھک کر بھاری ہو گیا —

اگلے دن ثمرین نے ایک لیڈی ڈاکٹر کے کلینک میں شوبھا کو صفائی کرنے کے کام پر رکھوا دیا، اور اس کو زندگی کا ایک نیا روشن پہلو دکھایا — جہاں وہ صرف اپنے ہونے والے بچے کے لیے زندہ رہے گی — اور خوشی کے ساتھ ہر آنے والے دن کا انتظار کرے گی — اس کے آدمی کو یہ معلوم ہونے نہ دیا کہ شوبھا کہاں بھاگ گئی —

اس طرح شوبھا کو نئی زندگی تو ضرور مل گئی لیکن یہ زندگی ادھوری تھی — پھر بھی اس ادھورے سہارے سے اچھی تھی — جس میں وہ جی رہی تھی — ثمرین اکثر کلینک جا کر شوبھا کا جائزہ لیتی رہتیں — بہ ظاہر وہ خوش ضرور نظر آتی تھی — لیکن اس کے دل میں چُبھے ہوئے کانٹے کا چُبھن اس کے چہرے پر عیاں رہتا تھا — شاید وہ اپنے ہونے والے بچے کے مستقبل سے فکر مند رہتی تھی — وہ اکثر سوچتی اس طرح کی زندگی گذارنے والی اکیلی شوبھا ہی نہیں تھی اور نہ جانے کتنی عورتیں شوبھا کی طرح جینے پر مجبور رہیں —

شوبھا کو نئی دِشا دکھا کر ثمرین مطمئن ہو گئیں — کئی دنوں بعد ایک دن وہ اپنے برآمدے میں بیٹھی ہوئی اخبار کی بساط پر سیاسی گھوڑوں کی چالیں دیکھ رہی تھیں کہ ایک نوجوان میلی کچیلی دھوتی قمیض پہنے ان کے سامنے آکر بڑے اداس لہجے میں بولا —

"شوبھا آپ کے یہاں بھی کام کرتی تھی نا بی بی جی —؟"

"ہاں —!" ثمرین نے چونکتے ہوئے کہا —

"دس گیارہ دنوں سے وہ اپنی کھولی میں لوٹی نہیں ہے بی بی جی —" نوجوان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں —

"تو گئی کہاں —؟" ثمرین نے انجان بن کر کہا — "ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کوئی رشتہ دار کے پاس چلی گئی ہو —"

"نہیں بی بی جی — دنیا میں میرے سوا اس کا کوئی نہیں — وہ مجھ سے خوش نہ تھی — روٹھ کر کہیں چھپ گئی ہے —" نوجوان شکستہ دل ہو کر برآمدے میں بیٹھ گیا —

"تمھارا اس سے کیا رشتہ ہے؟" — ثمرین نے اس سے پوچھا —

"مَیں اس کا آدمی ہوں بی بی جی — لیکن آپ سے جھوٹ کیا بولوں — بیاہ رچانے کا جو مَیں نے اس کو وچن دیا تھا — وہ نبھایا نہیں — شراب کی لت پڑتے ہی سب بھول بھال گیا — یہ بھی بھلا دیا کہ وہ میرے سکھ دُکھ کی ساتھی ہے — بی بی جی — سچ تو یہ ہے کہ نشہ میں آدمی ہو کر بھی میں آدمی نہیں رہتا — جانور بن جاتا ہوں — اور جانور بن کر مَیں نے صرف اس کو دُکھ ہی دیا تھا —" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانک کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا —

ثمرین تذبذب میں پڑی چُپ رہیں — وہ سوچنے لگیں کہ نئی دنیا پا کر بھی شوبھا ادھوری ہے، کوئی بھی عورت مرد کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی — وقت کے بخشتے ہوئے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچ کر انھوں نے کہا —

"اگر شوبھا مل جائے تو تم اس کی مانگ میں سیندور بھر دو گے —؟"

"ہاں —! بی بی جی — ایشور کی سوگند میں آپ کے سامنے اس کی مانگ کو سیندور سے بھر دوں گا — یہ بھی وچن دیتا ہوں کہ شراب منہ سے نہیں لگاؤں گا — اور ہمیشہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا —"

اس کا چہرہ جذبات کے بہاؤ سے تمتما اٹھا —

ثمرین دور اندیش تھیں — شرابی کی باتوں پر یقین کرنے کے لیے ان کا دماغ آمادہ نہ تھا، یہ بھی سوال لاحق تھا کہ شوبھا کا ردعمل کیا ہوگا —

"تم اپنی تلاش جاری رکھو — میں بھی کوشش کرتی ہوں کہ اس کو ڈھونڈ نکالوں — تم کل آکر ملو —" ثمرین نے کہا —

نوجوان نے اٹھ کر سلام کیا اور سر جھکا کر خاموش چلا گیا —

اس کے جاتے ہی وہ کلینک پہنچ گئیں اور شوبھا کو دیکھتے ہی دَم بخود ہو گئیں — وہ سُرخ

ساڑی میں ملبوس تھی ۔۔۔ اس کی پیشانی پر پسینہ ور بھرا تھا ۔۔ وہ بڑی خجالت سے بولی ۔۔
"معافی چاہتی ہوں میم صاحب ۔۔ آپ کو خبر نہ کر سکی ۔۔ بن باپ کے بچّہ کا جیون بھی اندھیروں میں ڈوب جانے کا اندیشہ تھا ۔۔ اس لیے اپنے ہونے والے بچّے کی خاطر میں نے اسی کلینک کے دربان کو اپنا جیون ساتھی بنا لیا ۔۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا ۔۔ اپنی ہر بھول ۔۔ ہر غلطی ۔۔ ہر ٹھوکر سے اس کو آگاہ کر دیا تھا ۔۔ اس کے بعد اس نے بڑی چاہت سے مجھے اپنانے کا اظہار کیا تو میں انکار نہ کر سکی ۔۔ وہ صحیح معنوں میں انسان ہے میم صاحب ۔۔ !"

ثمرین کے لبوں پر خوشیاں بکھر گئیں ۔۔
اب شوبھا ادھوری نہ رہی تھی ۔۔ پوری طرح مکمل تھی ۔۔

❑❑❑

ایثار

امیت اپنے آفس میں انتہائی اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھری ہوئی تھیں — ، چہرہ غصّہ کے دباؤ سے سُرخ ہو رہا تھا اور ٹیبل پر سالانہ آڈٹ کے کاغذات پیپر ویٹ سے دبے ہوئے ، پنکھے کی ہواؤں سے پھڑپھڑا رہے تھے اور اس آواز نے ایک پرانی بات اس کے ذہن میں اُچھال کر پھیلا دی — ، اس کی بیوی نے انتباہ بھرے لہجے میں اس سے کہا تھا —

" انیل کو کارخانہ میں کوئی کام دینے کے خلاف مَیں ہرگز نہیں ہوں ، لیکن تمھاری پھوپھی کے رویّہ سے اس کی نیت میں خامیاں پیدا ہو جانے کے امکان کو نظر انداز کرنا دانش مندی نہ ہوگی ، اور جس کارخانے کو تم اپنی محنت اور لگن سے بہت اونچا اٹھا چکے ہو ، وہ اس کی وجہ سے کہیں اپنا مقام کھو نہ دے — "

" تم فکر نہ کرو رینا — ، مَیں ہمیشہ اپنی آنکھیں کھُلی رکھتا ہوں — "

پندرہ سال پہلے جب اس کے باپ کی محبت بھری گھنی چھاؤں اس کے سر سے ہٹی تھی ، تو باپ کے اثاثوں میں ایک مٹی کا مکان اور موم بتی بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ اس کے زیرِ اقتدار آئے تھے اور اس کے ساتھ بیوہ پھوپھی اور اس کے زیرِ تعلیم ایک لڑکے کا بوجھ اس پر پڑا تھا ، آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا — عمر کم تھی ، تجربہ کا فقدان تھا ، کئی ہفتوں تک وہ دماغی بحران کی اذیت میں

ہتلا رہا تھا — پھر یکایک ایک روشنی چمک کر اس کے آگے پھیلی تھی — کالج کے ایام کے دوران اس کے اوصاف کی پاکیزگی دیکھ کر رینا اس سے بہت متاثر رہتی تھی، دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے پوشیدہ تڑپ بھی تھی، اُنسیت کا مضبوط رشتہ بھی تھا، اس کے سر پر یکایک جب دکھ کے بادل چھائے تھے تو خبر پاتے ہی بجلی سی چمک کے ساتھ وارد ہوئی تھی اور دکھ کے بادل تیرتے ہوئے منتشر ہونے لگے تھے — رینا کے والدین ترقی پسند خیالات کے تھے، اپنی بیٹی کی خواہش اور اس کی خوشی انھیں تمام حائل اڑچنوں سے زیادہ عزیز تھی، لوگوں کی انگشت نمائی کی پرواہ کیے بغیر انھوں نے چند ہی مہینے بعد رینا کو اس کا جیون ساتھی بنا دیا تھا — یہ ایک رشتہ ایسا تکمیل پذیر ہوا تھا جس کی شہرت جنگل میں آگ کی طرح پھیلی تھی، ایک طرف امیری کی بلندیاں تھیں، تو دوسری طرف غربت کی گہرائیاں — غریبی کا پھیلا ہوا جال جس کے اندر اس کا وجود پوری طرح پھنسا ہوا تھا — اس سے نجات دلانے کے لیے رینا اپنے ذہن میں مرتب منصوبہ پر عمل پیرا ہوئی تھی اور اس نے اپنے والدین کے ذرائع سے اس کو انڈسٹری محکمہ سے پانچ لاکھ روپیے کا قرض دلوا دیا تھا — وہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتا تھا — دُھن کا پکا — محنتی، ایمان دار اور اپنے حصول مقصد کے لیے آگ میں کود پڑنے کا حوصلہ رکھتا تھا — چند سال کے اندر ہی اس کی محنت رنگ لائی تھی، قرض کی وصولی کے ساتھ اس نے چھوٹا سا ایک مکان بھی بنوا لیا تھا، پُرانا مکان اور موم بتی کا کارخانہ اس نے اپنی پھوپھی اور اس کے لڑکے کے گذر بسر کے لیے الفیر دے دیا تھا —

یکایک دروازہ پر لگی گھنٹی بجنے لگی — وہ کرسی پر بیٹھا ہوا بولا —

" Come in "

ایک خوب صورت جوان لڑکی اندر داخل ہوتے ہوئے بولی —

" Sorry sir، آنے میں کچھ دیر ہو گئی —"

" تم یونین کے صدر کو فون کر دو کہ میں ان سے فوراً ملنا چاہتا ہوں "۔ امیت نے کہا۔

صدر یونین مسٹر بجاج کے آفس میں داخل ہوتے ہی اسٹینو اُرمیلا باہر نکل گئی اور مسٹر

بجاج کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے ___

" فرمایئے ___، کس لیے آپ نے یاد کیا ہے ___؟

" کارخانے کے سالانہ آڈٹ رپورٹ کے کاغذات ٹیبل پر ہیں ___، میں آپ سے صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کوئی ملازم جس نے چھ لاکھ روپیے کا غبن کیا ہو اور اس کے خلاف ٹھوس ثبوت بھی موجود ہوں تو کیا آپ ایسے کردار کے ملازم کی پشت پناہی کریں گے ___؟"

مسٹر بجاج چند سکنڈ تک سوچتے رہے، پھر یونین کے فرائض سمجھتے ہوئے بولے ___

" ہرگز نہیں ___، یونین ملازمین کے حقوق کی نگہبانی کے لیے بنائی جاتی ہے ___، کیا۔ میں اس ملازم کا نام جان سکتا ہوں ___؟ "

" انیل ___! "

" آپ کا رشتہ دار انیل ___؟ "

" جی ہاں "

" آپ یقین کریں یا نہ کریں ___، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی بداخلاقی سے زیادہ تر ملازمین خوش نہیں ہیں ___، پچھلے ماہ ملازمین کا ایک وفد مجھ سے ملا تھا کہ میں ان کی حرکتوں سے آپ کو خبردار کردوں، لیکن مجھے علم تھا کہ وہ آپ کے قریبی رشتہ دار ہیں ___، اور آپ تمام ملازمین کے ہمدرد، اس وجہ سے میں نے انھیں سمجھا کر رخصت کر دیا تھا ___"

" میں آپ کا بے حد شکر گذار ہوں مسٹر بجاج کہ آپ نے میرا راستہ ہموار کر دیا ہے ___، میں آپ سے خلوصِ دل سے وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ آپ جب بھی ملازمین کی جائز مانگ پیش کریں گے، ہم دونوں مل کر اس کا حل تلاش کرلیں گے ___"

مسٹر بجاج کے جاتے ہی انیل اپنے دماغی بحران سے پریشان ہو کر پھر ٹہلنے لگا ___، اس کا ذہن وقت کے عطا کردہ تلخیوں کی چبھن کے احساس سے بھرا تھا، جوں جوں وہ پرسکون ہوتا گیا، اس کے ذہن میں ماضی کی خوشبوؤں کے نقوش ابھرنے لگے ___ اس کی ازدواجی زندگی کا

پہلا پھول جب ڈیگاڈگی دینے لگا تھا، تو اس کے پاؤں کی دھول سے اُڑتی ہوئی خوشبو سے دونوں مسرتوں کے دریا میں تیرنے لگے تھے ـــــ لیکن بہار خزاں کا رشتہ جو اَن گنت صدیوں سے اٹوٹ ہے۔ جس طرح خوشی اور غم ایک دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں ـــــ کب خوشی کا دور شروع ہوگا، کب غم کی آندھیاں چلنے لگیں گی ـــــ؟ یہ انسانی سمجھ سے بالاتر ہے ـــــ، اور اسی مقام پر انسان خدا کے وجود کا قائل ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے ـــــ اس کے گھر میں پھیلی ہوئی بہار وقت کے اَن دیکھے پاؤں کی ایک ہلکی سی ٹھوکر سے خزاں کی تمازت کی لپیٹ میں یکایک آ گئی تھی ـــــ، کھلکھلا کر ہنستی ہوئی رینا کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی اور چند ساعتوں کے اندر اس نے دم توڑ دیا تھا ـــــ، یہ اتنا دل شکن حادثہ تھا کہ اس کی دماغی صلاحیت سوچنے سمجھنے کی طاقت سے محروم ہونے لگی تھی ـــــ، اس ایام میں گھر اور چھوٹے بچے کو سنبھالنے کا فرض پورا کرنے کی خاطر اس کی پھوپھی اپنے لڑکے کے ساتھ آدھمکی تھی ـــــ، پھوپھی کے دل کے اندر کی چاہ خواہ جو کچھ بھی ہو، انھوں نے خونی لگاؤ کے پیار کو اس دانائی سے چھلکایا تھا کہ اس نے بھی ماحول کی گھٹن میں کچھ راحت محسوس کی تھی اور جب گذرتے ہوئے وقت کے مرہم سے اس کے دل میں لگے گھاؤ کا جلن قدرے کم ہوا تو اس نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ اس کی پھوپھی گھر کے ماحول میں تیزاب چھڑک چکی تھیں ـــــ، خطرہ کا احساس ذہن کے گوشوں میں اُبھرتے ہی اس نے کئی جگہ فون سے طویل باتیں کی تھیں ـــــ اپنی طلب کا اظہار کیا تھا ـــــ

اگلے دن صبح کو ایک خوب صورت جوان لڑکی نے حاضر ہو کر اس کے لڑکے کو دیکھتے ہی اپنی گود میں اُٹھا لیا تھا اور پیار کے بوسوں کی بارش سے اس کے ہونٹوں پر مُسکان بکھیر دیا تھا۔ پھر وہ اپنی گود میں لڑکے کو لیے ہوئے بولی تھی ـــــ

" میں سنجو ـــــ، آپ کے لڑکے کی دیکھ ریکھ کے لیے حاضر ہو گئی ہوں سر ـــــ میں اناتھ آشرم میں پلی ہوں ـــــ "

" اپنے لڑکے کے لیے تمھارا والہانہ پیار دیکھ کر میرا دماغی بوجھ کچھ ہلکا تو ضرور ہوا ہے ـــــ، تمھاری یہی چاہت اور گرم جوشی برقرار رہی تو وہ ماں کو بُھلانے میں کامیاب رہے گا ـــــ "

"ماں کو پا کر پھر ماں کے لیے کیوں روئے گا سر ۔۔ ؟" سنجو بڑی متانت سے بولی تھی ۔۔
اسی شام اس نے اپنی پھوپھی سے بڑے احترام سے کہا تھا ۔۔
"میں نے وِکاس کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک تعلیم یافتہ گورنس کی خدمات حاصل کر لی ہیں ، لہٰذا آپ اور انیل اپنے گھر چلی جائیں ۔۔"
اس کی پھوپھی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں ۔۔ اپنے سنہرے سپنوں کے بکھر جانے کا سوچ کر انھوں نے عورت کے پُرانے حربوں کا استعمال کیا تھا ۔۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکاتے ہوئے بولی تھیں ۔۔
"تم جانتے ہو امیت کہ موم بتّی کا کارخانہ کئی مہینوں سے بند پڑا ہے ۔۔ آخر ہم دونوں کو دو وقت کی روٹیاں کس طرح ملیں گی ۔۔ ؟"
"اس فکر سے آپ کو نجات دلانے کے لیے میں نے راستہ تلاش کر لیا ہے ۔۔ کل سے انیل میرے کارخانے میں ایک اچھے پوسٹ پر کام کرے گا اور اچھی تنخواہ پائے گا ۔۔"
اس کی پھوپھی یکایک کِھل اُٹھی تھیں اور اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولی تھیں ۔۔
"جُگ جُگ جیو میرے لال ۔۔"

یکایک کال بیل بجنے لگا ۔۔ اور ماضی کے کہرے سے نکل کر وہ حال کے دائرے میں آ گیا ۔۔ ٹہلتے ٹہلتے اپنی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا ۔۔

اسٹینو اُرمیلا اندر داخل ہوتے ہوئے بولی ۔۔
"صدر یونین کے آجانے کی وجہ سے میں چلی گئی تھی ۔۔ کس لیے آپ نے یاد کیا تھا ۔۔ ؟"
"انتہائی رازداری سے انیل کی برخواستگی کا ایک آرڈر (Order) ٹائپ کر کے فوراً لے آؤ ، یہ بھی وضاحت کر دینا کہ اس نے کارخانے کا چھ لاکھ روپیہ غبن کیا ہے جس کا ٹھوس ثبوت موجود ہے ، پھر بھی ملازمین کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے وہ ایک ہفتہ کے اندر اپنی صفائی

میں تحریری بیان دے سکتا ہے جس پر چھان بین کی جائے گی۔"

اس کی برخواستگی کے کئی دنوں بعد اس کی پھوپھی اپنی آنکھوں کی کٹوریوں میں آنسوؤں کو بھر کر اس سے ملیں، پھوپھی کے لگاؤ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے التجائیں کیں۔ پریشانیوں کا تذکرہ کیا۔ لیکن نتیجہ صرف یہ نکلا کہ گذر بسر کے لیے وہ انھیں ماہانہ ایک ہزار روپیے دینے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

پانچ سال کے اندر پھیلے ہوئے دنوں میں سنجو کی سوجھ بوجھ اور پیار بھرے طریقوں نے اس کے بیٹے وکاس کے ننھے ذہن کو قندیل کی طرح روشن کر دیا تھا۔ وہ ہندی اور انگریزی کسی حد تک صحیح بولنے لگا تھا اور وہ وکاس کے گن دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا۔ سنجو اور وکاس کا کمرہ ٹھیک اس کے داہنی سمت تھا، درمیان میں ریشمی باریک پردہ ہواؤں سے اکثر اُترتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی جب سنجو سبق آموز کہانی وکاس کو سنایا کرتی تھی وہ بھی بڑے دھیان سے ان کہانیوں کو سُنا کرتا تھا۔ ایک رات جب وکاس کہانی سنتے سنتے سو چکا تھا، تو بادلوں کی گرج کے ساتھ تیز ہوائیں چلنے لگیں، کھڑکیوں کے پٹ کرخت آواز کے ساتھ کھلنے اور بند ہونے لگے تھے، سنجو جلدی جلدی اپنے کمرے کی کھڑکیاں بند کرنے لگی تھی، اس وقت چھناک سے آواز اُبھری تھی اور جب وہ بھاگتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی نظر امیت پر پڑی، اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ رینا کی تصویر فرش پر پڑی تھی اور شیشے کے ریزے بکھرے پڑے تھے، زندگی کے اٹوٹ رشتے کا درد اس میں پنہاں تھا۔ چوٹ چھپی تھی۔ سنجو اپنے جذبات کو دبا کر جلدی جلدی ریزوں کو اخبار کے ایک ورق میں سمیٹ کر تصویر کے ساتھ الماری میں بند کر کے اپنے کمرے میں پلٹ آئی تھی۔ تصویر کی اُڑان کا جو منظر اس نے دیکھا تھا اس سے وہ تڑپ اٹھی تھی۔ بھولی بسری یادیں بھی کتنے کانٹے چبھوتی ہیں۔ وہ سوچ کے ساگر میں ڈوبتی اور اُبھرتی رہی تھی۔

اگلی صبح تڑکے امیت کی نحیف سی تھرتھراتی ہوئی آواز ہواؤں میں تیرتی ہوئی سنجو کے کانوں میں جوں ہی گھسی، وہ لپک کر اس کے کمرے میں پہنچ گئی، بستر پر وہ چت پڑا تھا۔ اس کی

آنکھوں کی پلکیں نصف اٹھی تھیں، چہرہ پسینہ سے شرابور تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے، لیکن زبان کچھ کہنے سے قاصر تھی ۔ سنجو نے فون کر کے کئی ڈاکٹروں کو ارجنٹ کال کیے اور لطیف صاحب کو جن کے بارے میں وہ کئی بار امیت سے سن چکی تھی کہ کارخانہ میں ان سے زیادہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا ہے ، اطلاع دے دی، پانچ دس منٹ کے اندر کئی ڈاکٹر اور لطیف صاحب پہنچ گئے، ڈاکٹروں کے معائنہ کے بعد جلدی جلدی امیت کو Intensive Care میں داخل کر دیا گیا ۔ لطیف صاحب، سنجو اور وکاس ساتھ رہے، دن بھر اس کی حالت میں اتار چڑھاؤ آتا رہا ۔ لطیف صاحب بار بار خدا کے حضور میں جھک کر اس کی حیات کے لیے گڑگڑاتے رہے ۔ سنجو بھی بار بار ایشور سے پرارتھنا کرتی رہی ۔ اور دونوں کی التجاؤں نے اس کو نصف شب سے پہلے خطرے کی حدود سے باہر نکال دیا ۔

امیت کے دل پر یہ پہلا حملہ تھا ۔

کئی دنوں بعد وہ گھر آگیا ۔ ماحول پر چھایا ہوا غبار پوری طرح جب چھٹ چکا تھا، تو ایک دن اس نے سنجو سے کہا ۔

"میری علالت کی وجہ سے تم وکاس کو پہلے کی طرح وقت دے نہیں پاتی ہو اور تمھاری تربیت کے کارن اس کی سوجھ بوجھ میں کافی تعجب خیز اضافہ ہوا ہے ۔ اس میں کسی طرح کی گراوٹ نہ آنے پائے، مجھے تمہاری گراں رائے کی ضرورت ہے ۔"

"فرمایئے ۔"

"میرا خیال ہے کہ کوئی اعلیٰ اسکول جہاں ہوسٹل کا نظام بھی ہر طرح سے سازگار ہو، کیوں نہ وکاس کو وہاں داخل کرا دیں ۔"

"آپ کی علالت کے بعد میں اکثر اس پہلو پر غور کرتی رہی ہوں ۔ وکاس کے شان دار مستقبل کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے ۔"

سنجو نے صاف گوئی سے اپنے خیال کا اظہار کر دیا ۔

"تم چاہو تو مجھے اس ذہنی بھنور سے نکال سکتی ہو، اور وکاس کے مستقبل کی فکر سے مجھے

نجات مل سکتی ہے ۔" امیت نے اپنی نگاہیں جھکائے ہوئے کہا۔
"میں ۔۔ ؟" سنجو چونک گئی۔
"ہاں سنجو ۔ مجھے تم سے یہ کہتے ہوئے کوئی شرم نہیں کہ میری پھوپھی اور ان کا لڑکا حد درجہ مکار، عیار اور لالچی ہیں اور وکاس کو ابھی سنِ بلوغت چھونے میں بارہ سال کا طویل وقفہ ہے۔ مجھے جو مرض لاحق ہو چکا ہے، کسی وقت بھی دوسرا حملہ جان لیوا بن سکتا ہے، اس کے سنِ بلوغ تک پہنچنے سے پہلے اگر میری آنکھیں بند ہو گئیں تو قانونی طور سے میری پھوپھی اس کی نگہبان بن جائے گی ۔ کارخانہ تو تباہ ہو گا ہی اس کے ساتھ وکاس کا مستقبل گردِ راہ میں لپٹ جائے گا ۔"
"حیات کی ڈور ایشور کے ہاتھ ہے اور موت سے پہلے حوصلہ کھو دینا بزدلی کی علامت ہے لیکن دانائی کا تقاضا ہے کہ خدشات کو ہم نظر انداز بھی نہ کریں ۔ آپ کا وکاس کے مستقبل کے متعلق تمام پہلوؤں پر غور کرنا بالکل صحیح قدم ہے ۔" سنجو نے کہا۔
"تم جب پہلے پہل آئی تھیں تو تم نے خود کہا تھا کہ وکاس ماں کو پا کر ماں کے لیے کیوں تڑپے گا ۔ اور تم نے ماں کا پیار دے کر یہ ثابت بھی کر دیا ۔ اب اس کے مستقبل کی بیچ بھنور میں پھنسی ہوئی ناؤ کی پتوار تمہارے ہاتھ میں ہے ۔ اس کی ماں کا حقیقی مقام لینا یا نہ لینا تمہاری خواہشات پر منحصر ہے اور میں تمھیں وچن دیتا ہوں کہ میں تمہاری مرضی کا صدقِ دل سے احترام کروں گا ۔ لیکن تم وکاس کے سنہرے مستقبل کی خاطر قانونی طور سے اس کی ماں بننا قبول کر لو ۔"
چند منٹوں تک وہ سر جھکائے ہوئے اپنی گردن کے آگے پھیلی ہوئی ویرانیوں میں بھٹکتی رہی ۔ وِکاس سے اس کا لگاؤ، محبت کی تمام تہوں کو توڑ کر اس کے دل کے وسیع حلقے میں پھیل چکا تھا ۔ امیت کی شرافت، اس کی پاکیزگی کی وہ پوری طرح قائل تھی، اتنے دنوں تک ساتھ قیام کرنے کے باوجود امیت کے اکیلاپن نے اس کو اپنے مقام سے گرنے نہ دیا تھا ۔۔۔ جوانی کی چنگاریاں دونوں دلوں میں تھیں ۔ جذبات کے ریلے بھی تھے ۔ ان سب کے ہوتے ہوئے بھی دونوں کا درمیانی فاصلہ برقرار تھا اور ان تمام حقیقتوں کو سنجیدگی سے سوچتے ہوئے سنجو نے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کر کے بڑی عقیدت سے امیت کے چرنوں کی دھول سے اپنی مانگ بھر لی ۔

کورٹ میرج کے بعد وکاس کو ایک اعلیٰ اسکول کے ہوسٹل میں داخل کر دیا گیا، اور تقریباً ہر روز سنجو اس کی مصروفیات پر نظر رکھنے کی خاطر اس کے پاس جاتی رہی ___ اسی دوران میں ایک بار پھر امیت کے دل پر مرض کا ہلکا سا حملہ ہوا اور چند دنوں کے اندر وہ صحت یاب بھی ہو گیا ___ لیکن دوسرے جھٹکے کے بعد وہ گہری فکر کے حصار میں پھنس گیا ___ سنجو نے ہر چند اس کے خیالات کی اُڑان کے رُخ کو موڑنے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے تھے لیکن وہ کامیاب نہ ہو پائی تھی ___

ایک دن آفس سے آتے ہی امیت نے سنجو کو ٹائپ شدہ سرکاری مہریں ثبت کیے ہوئے کاغذات دکھائے اور بہت دیر تک دونوں رازداری سے طویل باتیں کرتے رہے ___ اس دن امیت انتہائی خوش تھا ___ جیسے کہ اس نے اپنی زندگی ہاری ہوئی بازی جیت لی ہو ___ دونوں ساتھ وکاس سے ملنے ہوسٹل بھی گئے، وکاس کے ساتھ ہنستے بولتے اور خوشیوں کے رنگ فضا میں اُچھالتے رہے ___ انسان نہیں جانتا کہ پل بھر کے بعد کیا ہو گا ___؟ خوشیاں بکھریں گی یا غم کا دُھواں پھیلے گا ___ امیت کی زندگی کا وہ خوشیوں بھرا دن، ڈھلتی ہوئی رات میں اس کی زندگی کی آخری رات بن گئی ___ سنجو اپنی قسمت پر نہ چیخ کر روئی اور نہ چلائی ___ شاید وہ جانتی تھی کہ اس کی زندگی میں یہ وقت جلد ہی آنے والا ہے، ممکن ہے ڈاکٹروں کے باہمی مشوروں کی باتیں اس نے سُنی ہوں ___ انتہائی ضبط و تحمل سے خود کو سنبھالتی ہوئی اس نے سب سے پہلے اس عظیم حادثہ کی خبر لطیف صاحب کو دی، جب آئے تو ان کے چہرے کی جھریاں کپکپا رہی تھیں اور آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ کر سُرخ تھیں ___ انھوں نے سنجو کے سر پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ___

"جب تک مَیں زندہ ہوں تمھیں اپنی بیٹی سمجھ کر اپنا فرض نبھاؤں گا ___ تمھیں انتہائی ضبط سے کام لینا ہو گا ___ وکاس کے ننھے دل پر باپ کی جُدائی کے اثرات چھانے نہ پائیں، دستاویزات کی رُو سے اب تم کارخانہ اور امیت کی ملکیت کی سربراہ ہو ___ میری خواہش ہے کہ تین دنوں تک امیت کی جدائی کے غم میں کارخانہ بند کر دیا جائے ___"

"مَیں آپ کو اپنا سمجھ کر آپ کا ہر حکم تسلیم کرتی رہوں گی ___" سنجو بے قابو ہو کر رونے لگی۔ لطیف صاحب اس کو بہت دیر تک تسلیاں دیتے رہے ___ وقت کے اہم تقاضوں پر

روشنی ڈالتے رہے ۔ امیت کی پھوپھی کی شطرنجی چال سے بچنے کے لیے خبردار کرتے رہے ۔

اگلے دن جب امیت کی ارتھی اٹھنے لگی تو سب سے زیادہ اس کی پھوپھی نے اپنی دل خراش چیخوں کے ساتھ اپنے غم کا مظاہرہ کیا ۔ کئی بار سینہ پیٹتی ہوئی زمین پر گریں ۔ کئی بار ان کے چہرہ پر پانی کے چھینٹے ڈالے گئے ۔ سنجو محو حیرت بنی سب کچھ دیکھتی رہی ۔ ظاہر اور باطن کے فرق کو ۔ سچائی اور جھوٹ کو ۔ کم سن وکاس نے جب چتا سلگائی تو اس کے ہاتھ میں لغزش ہونے لگی ، سنجو نے فوراً اس کا بایاں ہاتھ سہارا بخشنے کی خاطر تھام لیا ۔

شرادھ کے بعد بھی امیت کی پھوپھی کا اس گھر میں قیام کرنے کا ارادہ تھا لیکن لطیف صاحب نے سخت رویہ اپنا کر ان کو چلے جانے پر مجبور کر دیا ۔ وکاس کے ہوسٹل منتقل ہونے کے بعد جب وہ کارخانہ کی سربراہ بن کر لطیف صاحب کے ہمراہ پرسنل برانچ کے بڑے ہال سے گذرنے لگی تو تمام ملازمین اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے ، سنجو کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور اس نے انتہائی مہذب انداز سے کہا ۔

" میں تمام جوان ملازمین کی بہن اور بزرگوں کی بیٹی ہوں ، میرے استقبال میں اس طرح کھڑے ہو کر مجھے اپنے دلوں سے گرانے کی کوشش دوبارہ نہ کریں گے ۔ ورنہ مجھے دکھ ہو گا ۔ "

سنجو کے اِن دو جملوں نے جو تاثر چھوڑا وہ ملازمین کے دلوں میں اَمِٹ پیار بن کر جم گئے ۔ آفس میں داخل ہو کر اس نے لطیف صاحب سے کہا ۔

" جن امور پر ہم دونوں متفق ہو چکے وہ احکامات جاری کر دیئے جائیں ۔ "

" کاغذات تیار ہیں ۔ صلاح کار کی حیثیت سے میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا اور صدر یونین مسٹر بجاج کے چھوٹے بھائی راہول بجاج جن کی ایمان داری پر شک کرنا میں گناہ سمجھتا ہوں ۔ وہ میرے ٹیبل کی ذمہ داریاں سنبھالیں گے ۔ "

احکامات کے جاری ہونے کے چند لمحوں بعد مسٹر راہول بجاج اجازت لے کر اندر داخل ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے بولے ۔

" میڈم ۔ اتنے اہم عہدے کے لیے میں خود کو تجربہ کار نہیں سمجھتا ہوں ۔ "

لطیف صاحب کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی، وہ اپنے قریب ایک کرسی پر راھول بجاج کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"ہیرا خود اپنی شناخت نہیں کر سکتا، ایمانداری سے کام کرنے کی لگن تمام تجربوں سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، ساتھ ہی بڑے بھائی کے ناتے میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے دستخط شدہ اہم کاغذات کی پوری طرح چھان بین کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔"

اس مثلث کی تشکیل کے بعد کارخانہ کے مالک اور ملازمین کے درمیان کی دوری کم ہونے لگی، اور کارخانہ کے پروڈکشن میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

سنجو ہر دوسرے تیسرے دن وکاس سے ملنے ہوسٹل جاتی رہی، اور اس کی ہر جائز خواہشات پوری کرتی رہی۔ ایک دن وہ وکاس سے یہ جان کر چونک اُٹھی کہ پھوپھی نے بھی وکاس سے ملنے کا آغاز کر دیا ہے۔ وکاس کی عمر کچی تھی، پیار کی چادر میں گھس جانا اس کے لڑکپن میں داخل تھا، لیکن سنجو کی سوچ کا انداز مختلف تھا۔ اپنی سوچ کی گہرائیوں میں جب وہ اُتری تو پھوپھی کی عیاری کے پھیلے ہوئے خیال کا تصور کر کے بے چین ہو اُٹھی۔ کچی مٹی سے بنتے ہوئے ظروف کی شکل بدل دینا بالکل سہل سی بات ہوتی ہے۔ اسی دن پرسنل وکیل اور لطیف صاحب سے سنجو بہت دیر تک رازدارانہ باتیں کرتی رہی۔ اور ان باتوں پر پوری طرح عمل کر کے کسی حد تک وہ پرسکون ہو گئی۔ تیسرے دن کورٹ سے جاری کردہ حکم نامہ سے یہ حقیقت وہ جان پائی کہ وکاس نے امیت کی پھوپھی کے توسط سے کورٹ میں ایک درخواست دی تھی کہ اس کی سوتیلی ماں کا برتاؤ اس کے ساتھ زہریلا بن چکا ہے اور باپ کی ملکیت کی وجہ سے اس کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ لہٰذا ہوسٹل سے اس کو باپ کی پھوپھی کے ساتھ قیام کرنے کی اجازت دی جائے، کورٹ سے اس کے حق میں حکم جاری کرتے ہوئے سنجو کو ۱۰ اپریل کے دن کورٹ میں حاضر ہو کر بیان کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ سنجو نے فوراً اسکول کے پرنسپل سے جانکاری حاصل کی تو معلوم ہوا کہ گذشتہ شام کو ہی وکاس جا چکا تھا۔ اس نے لطیف صاحب کو طلب کر کے کورٹ کا حکم نامہ دکھایا۔ وہ بے اختیار ہو کر ہنستے ہوئے بولے۔

"چھل کپٹ، بے ایمانی، دغا اور بُہتان تراشی جب بے نقاب ہوتے ہیں تو ۔۔۔ ان ہتھکنڈوں کو استعمال کرنے والے فوراً اپنے جال میں پھنس کر خندق میں گر جاتے ہیں ۔۔"

۱۰ را پریل کے دن اجلاس کے اندر اگلے صف میں پھوپھی، ان کا لڑکا اور دِکاس بیٹھے تھے، سنجو بیان دینے کے لیے جب کٹہرے کے اندر داخل ہوئی تو وکیلِ استغاثہ نے اجلاس کے آداب و طریقہ کو اپناتے ہوئے کھڑے ہو کر الزامات پڑھنے کی جج سے اجازت مانگی ۔۔ اس سے پہلے کہ جج لب کشائی کرتے، سنجو نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔۔

"می لارڈ ۔۔ اجلاس کا قیمتی وقت برباد کرنے سے پہلے میری التجا ہے کہ یہ رجسٹرڈ دستاویز کا آپ بہ غور معائنہ کرلیں ۔۔ اس کے بعد بھی آپ ضروری سمجھتے ہوں تو میں بیان دینے کے لیے تیار ہوں ۔۔"

جج اس رجسٹرڈ دستاویز کا کچھ دیر تک غور سے معائنہ کرتا رہا ۔۔ پھر اپنا حکم صادر کرتے ہوئے کہا ۔۔

"سنجو دیوی پر جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ سراسر بے بنیاد ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے پتی کی تمام ملکیت قانونی طور سے اپنے سوتیلے بیٹے وکاس کے نام منتقل کر دی ہے اور خود کارخانے میں ملازم کی حیثیت سے معمولی تنخواہ لیتی ہیں یہ کیس خارج کیا جاتا ہے ۔۔"

دکاس اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھاگتا ہوا سنجو کے پاس پہنچ گیا اور جُھک کر اس کے چرنوں کو چھوتے ہوئے بولا ۔۔

"میں جھوٹے پیار کے پھندے میں پھنس گیا تھا ماں ۔۔ مجھے معاف کر دو ۔۔ ؟"

سنجو نے دِکاس کو اٹھایا اور اس کی پیشانی کو چوم کر اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا ۔۔

□□□

کہاں ڈھونڈا کہاں پایا

فضلو کی تن تنہا زندگی بڑی ڈیوڑھی میں سر چھپانے کی جگہ پا کر سکون سے گذر رہی تھی۔ وہ کوئی چھوٹا موٹا دھندا کر لیا کرتا تھا۔ ایمان کی قیمتی پونجی اس کی حیات کا سرمایہ تھی۔ محلّہ کے ضرورت مند لوگوں کے سکھ دکھ میں اپنے نقصان کا خیال کیے بغیر وہ ان کے کام آتا تھا۔ اسی وجہ سے معمولی آدمی ہوتے ہوئے بھی لوگوں کی نگاہوں میں اس کا ایک مقام تھا۔ وقت کی بے رحمی نے ایک دن اس کو اُجالے سے اندھیرے میں ڈھکیل دیا۔ ایک حادثے نے اس کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کو ٹخنے کے نیچے سے تن سے علٰحدہ کر دیا۔ اس کے علاج کے دوران ڈیوڑھی اور محلّہ کے لوگ اسپتال میں اس کی دیکھ ریکھ کرتے رہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد ڈیوڑھی کے بڑے مالک جب تک زندہ رہے اس کو دو وقت کی روٹی ملتی رہی۔ محلے کے رحم دل لوگ بھی وقتاً فوقتاً اس کی ضروریات پوری کرتے رہے، لیکن بڑھی ڈیوڑھی کے مالک کے انتقال کے بعد سے اس کی اہمیت روز بہ روز گھٹتی گئی۔ محلّہ والے بھی چشم پوشی کرنے لگے اور وہ فاقہ کشی کا شکار ہونے لگا تو مجبور ہو کر اس نے ہاتھ پھیلانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس کے آگے ایک کٹھن سوال بھی تھا۔ وہ سوال اس کی عزّت کا تھا، وقار کا تھا۔ اس احساس کا تھا کہ کیا وہ اپنے جاننے والوں کے آگے اپنا ہاتھ پھیلا سکے گا ؟ ۔ ایک رات جب اس کے پیٹ کی بھٹی دہکتی ہوئی تھی تو اس رات وہ چپکے

سے اپنی بیساکھی کے سہارے بڑی ڈیوڑھی سے نکل کر ٹرین میں سوار ہو کر کسی دوسرے شہر میں پہنچ گیا۔

وہاں اس نے پہلی بار ہاتھ پھیلا کر صدا لگائی۔

"جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔"

کئی گھنٹوں تک جگہ جگہ رک کر صدا لگانے کے بعد اس کے ہاتھ میں صرف اتنے پیسے آئے کہ وہ چند روٹیاں خرید کر بھوک الاؤ میں ڈال سکا۔

آج کے دَور کے عوام آخرت کا دھیان چھوڑ کر حال کو ہر طرح سے سنوارنے کے جتن میں لگے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے حاجت مندوں سے چشم پوشی عام سی بات ہو گئی ہے۔ صرف مقدس تہوار کے موقع پر خیر خیرات کے لیے جنت پانے والوں کی فہرست میں اپنے ناموں کو جوڑنے پر اکتفا کرنے لگے ہیں۔ ریلوے کے حدود میں پولیس کے عملوں سے تنگ آ کر اس نے بڑی مسجد کا رُخ کیا۔ اتفاق سے وہ جمعہ کا دن تھا۔ مسجد کے قریب جب وہ پہنچ گیا تو پیش امام کا صداقت بھرا خطبہ اس کے کانوں میں شہد کا رس انڈیلنے لگا۔

"اللہ کے وہ نیک بندے جو احکامِ الٰہی کی ڈور کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں انہیں اور فرائض کی تکمیل کے ساتھ مجبور اور یتیموں پر بھی پوری توجہ دینی چاہیے کیوں کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو میرے بھوکے بندے کو ایک روٹی دے گا میں اسے ستر روٹیوں سے نوازوں گا، جو ان کے ننگے بدن کو ایک پوشاک سے ڈھانکے گا میں اسے زر و جواہرات کی پوشاک عطا کروں گا۔"

خطبہ سن کر فضلو کا دل خوشی سے جھوم گیا۔ اس نے امام کی حق گوئی پر انھیں لمبی عمر پانے کی دُعائیں دیں اور جلدی سے خود بھی آخری صف کے ایک کنارے بیساکھی رکھ کر فریضہ نماز ادا کرنے کے لیے بیٹھ گیا، اور نماز ختم ہوتے ہی وہ اپنی بیساکھی کی مدد سے مسجد کی سیڑھی پر آ کر اپنا ہاتھ پھیلا کر صدا لگانے لگا۔

"جو دے اس کا بھی بھلا۔ جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔"

آخری نمازی بھی جب اس کے آگے سے گذر گیا۔ تو اس نے سارے پیسوں کو گنا۔ دو روپیے

ساٹھ پیسے تھے۔ وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پیش امام کے دلوں کو روشن کرنے والے خطبے نے نمازیوں پر اپنا کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ سیکڑوں افراد نے نماز ادا کی تھی اور ان سے اس نے پایا تھا کیا؟ کُل دو روپے ساٹھ پیسے۔ سوچا کہ ضرور اس میں اس کی قسمت کی کھوٹ کا راز ہے۔ پھر کئی ہفتوں تک مسجد کی سیڑھیاں اس کے لیے رزق کے حصول کا ذریعہ رہیں۔ دو وقت کی روٹی۔ دو پیالی چائے اور بیڑی کا ایک بنڈل اسے ملتے رہے۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹنے لگے تو اسے تن ڈھانکنے کی فکر لاحق ہوگئی۔ لہٰذا اپنا اڈہ بدل کر وہ ایک مندر کے دوار پر پہنچ گیا۔ وہاں بھی گیانی پنڈت وید اور رامائن کی باتیں دہرا رہے تھے۔

"ایشور کی سب سے بڑی بھگتی منُش کی سیوا میں ہے۔ جو منش کی بپتا میں کام نہیں آئے گا، مکتی نہیں پائے گا۔"

بات یہاں بھی وہی کہی جا رہی تھی جو پیش امام نے اپنے خطبے میں کہی تھی۔ اس نے سوچا یہ پوتر استھان ضرور اس کے کھلے تن کو ڈھانکنے کا انتظام کر دے گا۔ لیکن نتیجہ نکلا توقع کے برعکس۔ مسجد اور مندر میں فرق صرف اتنا تھا کہ وہ دو علیحدہ عقیدہ کے لوگوں کی عبادت گاہیں تھیں۔ لیکن دونوں عقائد کے لوگ ایک ہی سی روش پر گامزن تھے۔ ہفتوں تک اس جگہ پر بھی وہ اپنی صدا بلند کرتا رہا۔ لیکن جب اس کے حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہو پائی تو اس نے تیسرا اڈہ بدلا۔

یہ چرچ گیٹ تھا۔ یہاں اتوار کے دن کاروں کی قطاریں لگ جاتی تھیں۔ پہلا اتوار اس کے لیے مسجد کی سیڑھی اور مندر کے دوار سے زیادہ بہتر ثابت ہوا۔ لیکن بعد کے اتواروں نے یہ واضح کر دیا کہ یسوع کے عقیدت مند بھی ان کے احکام کو ایمانداری سے پورا نہیں کر رہے ہیں۔ بیکاروں، کنگالوں، فقیروں اور لاچاروں کی جائے پناہ ریلوے کا ویٹنگ ہال ہوتا ہے۔ ایک رات فضلو ویٹنگ ہال میں بیٹھا ہوا چنے پھانک رہا تھا اور اس کے قریب ہی ایک آدمی اپنے سامنے تندوری روٹیاں اور مٹی کے پیالے میں گوشت رکھے ہوئے تھا۔ اس نے فضلو کے پھٹے حال پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"بھیک مانگنے اور دینے پر تو ابھی سرکار نے کوئی ٹیکس لاگو نہیں کیا ہے؟ پھر چھپا کاہے کو چبا رہا ہے۔؟"

"کیا کروں۔؟ بھیک دینے والے ہزاروں میں ایک ملتے ہیں"۔۔ فضلو کی آواز میں درد پنہاں تھا۔

"آ..... روٹیاں کھا"۔۔ اس نے کہا۔۔ "دل والوں کی جگہ تو نے دیکھا کہاں ہے رے"

دو روٹی پر گوشت کے چند ٹکڑے رکھ کر اس نے فضلو کو دے دیا۔

فضلو کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو نکل پڑے۔

"ارے تو کاہے کو رونے لگا۔۔ چنا پھانک رہا تھا تو ٹھیک تھا۔۔ روٹی گوشت پاکر رو پڑا۔ کیسا اُلٹی کھوپڑی کا ہے رے تو۔۔"

جواب میں فضلو چُپ رہا۔

اس نے چند لقمے اپنے حلق میں ڈال کر کپڑے میں لپٹی بوتل نصف خالی کر کے کہا۔

"کل چار بجے میں تیرے کو اسی جگہ ملوں گا اور تیرے کو اپنے ساتھ ایسی جگہ لے چلوں گا جہاں ہمیشہ تیری بھوک مٹتی رہے گی اور تیرے بدن پر بھی نیا کپڑا آتا رہے گا۔"

"غریب سے کیوں مذاق کرتے ہو بھیا۔۔ میں مسجد، مندر اور گرجا جیسے مقام میں اپنی قسمت کا تماشہ دیکھ چکا ہوں۔" فضلو نے کہا۔

"تیرے کو کچھ معلوم نہیں۔۔ لوگوں کے بارے میں کچھ اتا پتا نہیں ہے"۔۔ اس نے پانچ کا ایک نوٹ فضلو کو دیتے ہوئے کہا۔۔ "صبح اور دن میں کچھ کھا پی لینا، اور چار بجے میں تیرے کو نئی دنیا کا سیر کرانے لے چلوں گا۔"

اگلے دن فضلو اس کے ساتھ جس کا نام جان تھا وقت مقررہ پر مل کر دارو کے اڈے پر پہنچ گیا۔ وہاں جان بہت مقبول تھا۔۔ اس کو دیکھتے ہی ایک شخص نے اس سے پوچھا۔

"کس کو ساتھ لے آیا۔۔؟"

"پاگل ہے"۔۔ جان مُسکرایا۔

"پھر لایا کاہے کو۔؟" اس کی نگاہوں میں تعجب تھا۔

"یہاں کا راستہ جان لے۔ پیتا دیتا نہیں ہے"۔ جان نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"سچ کرموا ہے، کاہے کو بولوں، لیکن نہ بولوں گا تو جانے گا نہیں تو ___ بات یہ ہے کہ یہ مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر نمازیوں سے مانگتا رہا ہے۔ مندر کے دوار پر جاکر ایشور بھگتوں کے آگے ہاتھ پھیلایا ہے ___ حتیٰ کہ میرے یسوع کے گرجا گھر بھی صدا لگا چکا ہے۔ لیکن اس کے بدن پر پھٹا کپڑا ہے اور رات یہ چنا پھانک رہا تھا ___"

"جب تو بڑا کام کیا ہے جان تونے"۔ اس نے کہا ___ "آج اس کی بند آنکھ کھلے گی۔ خدا کا نیا گھر دیکھے گا۔ جان لے گا کہ اللہ، ایشور، گرو اور یسوع کو سچے دل سے ماننے والے دارو کے اڈوں پر بھی ملتے ہیں۔"

اسی وقت پگڑی باندھے ہوئے ایک آدمی گھاس کے فرش سے اُٹھتا ہوا ترنگ بھری آواز میں بولا ___ "جان، تیرے صدقے جانواں ___ اَکھا دو سو کلیومیٹراں سے گاڑی چلا کر آواں ہوں، لوگاں آج کل لوٹنے میں لگے ہیں، اَکا چنگی چکایا، دکّا رشوت دیا ___ غریباں کا کوئی دیکھن والا نہیں۔" اس نے بیس روپیے کا ایک نوٹ اپنی جیب سے نکال کر فضلو کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

فضلو حیرت زدہ تھا ___ خاموش ___ چُپ ___'

جان کھلکھلا کر ہنستا ہوا بولا۔

"دیکھ لیا نا ہماری دُنیا ___ ؟"

اور اس رات فضلو نے اتنا پایا کہ دیر رات گئے تک وہ ویٹنگ ہال کے ایک کونے میں اکڑوں بیٹھا ہوا سوچتا اور بڑبڑاتا تھا ___

"عجیب ماجرا ہے تیرا مولا ___ تو رہتا کہاں ہے اور پتہ کہیں اور کا دیتا ہے ___"

□□□

خلش

فرسٹ کلاس کوچ میں اپنے برتھ پر کھڑکی سے ٹیک لگائے کادش خاموش بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ اداس، آنکھیں نیند سے بوجھل اور دل میں اُٹھتی ہوئی آرزوئیں ضبط کے پتھر سے دبی تھیں ـــــ یکایک اس کے ذہن کی سوئی ماضی کی طرف گھومنے لگی ـــــ جوبلی پارک میں ٹہلتے ہوئے اس کی آنکھوں کے حصار میں ایک حسین چہرہ آگیا تھا ـــــ نہ بجلی گری اور نہ آفتاب نے آگ اگلا۔ لیکن اس کے دل میں ایک خواہش تڑپ اٹھی ـــــ وہ دیر تک ان لڑکیوں کے غول کا پیچھا کرتا رہا ـــــ کبھی اس کی کمر کے خم کو دیکھتا۔ کبھی دائیں کبھی بائیں ہو کر اس کے چہرے کو ہر زاویئے سے دیکھتا رہا تھا ـــــ ہر بار اس نے انجانی لذت محسوس کی تھی ـــــ پھر وہ چہرہ کار کے کھلتے ہی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا ـــــ دل میں جاگی ہوئی تڑپ سے مغلوب ہو کر کئی دنوں تک اس چہرہ کو کبھی پارک، ـــــ کبھی سڑکوں، ـــــ کبھی بازاروں میں تلاش کرتا رہا تھا ـــــ لیکن اس کی نگاہوں میں اس چہرہ کی ہلکی سی بھی جھلک نظر نہ آئی تھی ـــــ

ایک شام جب وہ اداس گھر واپس لوٹا تو اس کی ماں نے بڑے پیار سے کہا ـــــ "اس بار تمہیں میری خواہش پوری کرنی ہوگی بیٹا ـــــ"

"کون سی خواہش ماں ـــــ؟"

"یہی کہ اس بار شادی کرنے کے بعد ہی تمہیں جانے دوں گی ـــــ"

اس نے ماں کو اپنی بانہوں میں لے لیا ۔ اور مسکراتے ہوئے کہا ـــــ "کہیں آپ نے میرے لیے لڑکی پسند کر رکھی ہے کیا ـــــ ؟"

"نہیں بیٹا ـــــ ویسے چند تصویریں تم سے رشتہ کے لیے میرے پاس آئی ہوئی ہیں، یہ تمہاری زندگی کا انمول سودا ہے ـــــ اپنی دلہن پسند کرنے کا حق صرف تمہارا ہے ـــــ" ماں نے کہا ـــــ

ماں نے چند تصویریں ٹیبل کے دراز سے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا ـــــ "دیکھو بیٹا، اگر اس میں سے کوئی تصویر پسند آجائے تو مجھے بتا دینا ـــــ"

"اچھا ماں ـــــ"

وہ تصویریں دیکھنے لگا ـــــ ایک تصویر کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ـــــ وہ فوج میں میجر تھا ـــــ فہم و ادراک سے اس کا دماغ پوری طرح بھرا تھا ـــــ اس نے اپنی تڑپ کا اظہار کیے بغیر ہلکی آواز سے کہا ـــــ

"ماں ـــــ یہ لڑکی میری شریکِ حیات بن سکتی ہے" ـــــ تصویر بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس کی ماں خوشی سے جھوم اٹھی ـــــ کاوش کی دبی خواہش پوری ہونے جا رہی تھی ـــــ اس نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ جس لڑکی کی تلاش میں وہ در در بھٹک رہا تھا ـــــ اس کے رشتہ کا پیغام اس کے گھر پر دستک دے رہا ہے ـــــ ماں تصویر لیتے ہوئے بولی ـــــ

"تمہاری طرح اس لڑکی کا باپ بھی فوج میں بڑا افسر تھا ـــــ گھرانا اچھا ہے ـــــ تعلیم یافتہ لوگ ہیں ـــــ اور اُس گھر کا ماحول بھی اچھا ہے ـــــ" اس کی ماں نے کہا

"میں آپ کی خواہش کا احترام کرتا ہوں ماں ـــــ" اس نے مسکرا کر کہا

"جُگ جُگ جیو میرے لال ـــــ مجھے تم سے یہی امیدیں تھیں ـــــ" اس کی ماں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے دعائیں دیں ـــــ

چند دنوں بعد بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی ہو گئی ـــــ جس کا حسین چہرہ کبھی

پارک میں اس کی آنکھوں کے حصار میں آیا تھا ـــــ آج حجلۂ عروسی میں پھولوں سے سجی سجائی گدیلی مسہری پر اس کی مرکزِ حیات سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی ـــــ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا ـــــ
اس کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا، جب ایک لڑکی کا قرب حاصل ہوا تھا ـــــ اس نے بڑے پیار سے اس کے صندلی ہاتھوں کو جب اپنے ہاتھوں میں لیا اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو اس کے ہونٹوں میں غضب کی جنسی کشش تھی، ـــــ وارفتگی کے عالم میں کبھی اس نے اس کے ہاتھوں کو چوما، ـــــ کبھی اس نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا، ـــــ پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر اس کے رخسار کو لے کر جب اپنے ہونٹوں کو اس کے جلتے ہوئے ہونٹوں سے لگایا تب اس کے دماغ میں پیدا ہو کر ایک سنسنی سارے جسم میں بجلی کی طرح دوڑ گئی ـــــ وہ انجانی لذت سے سرشار ہو گیا ـــــ رات کی طویل گھڑیاں لمحوں میں سمٹ کر معدوم ہونے والی تھیں تو یکایک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی ـــــ وہ جھلا گیا ـــــ جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کا بھائی کھڑا تھا ـــــ

"بھائی جان ـــــ پولیس انسپکٹر آپ سے ملنے آئے ہیں" ـــــ خبر سن کر جیسے ہی وہ باہر آیا، پولیس انسپکٹر نے سلامی دیتے ہوئے کہا ـــــ

"سر! یہ آپ کا لیٹر ہے" ـــــ

کاوش سمجھ گیا کہ ہماری چھٹی کینسل کر دی گئی ہے ـــــ وطن پر ضرور کوئی خطرہ آپڑا ہے اس نے لیٹر پڑھا ـــــ اس کی فرصت منسوخ کر دی گئی تھی ـــــ اور فوراً ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنے کا حکم دیا گیا تھا ـــــ

یہ رات زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے ـــــ برسوں برس سے دبی ہوئی چنگاریاں لہکتی ہیں ـــــ اس نے اپنی بیوی سے بڑی متانت بھری آواز میں کہا ـــــ

"میں فوج کا ایک ذمہ دار افسر ہوں ـــــ خواہش تو یہ تھی کہ تمہارے ساتھ اپنی فرصت کے اوقات میں طرح طرح سے رنگ بھرتا ـــــ لیکن فرض کی پکار ذاتی خواہش سے زیادہ افضل ہے ـــــ تم ایک میجر کی بیوی ہو، ـــــ تمہارے دل میں بھی وطن کی خدمات کا یقیناً

احساس ہو گا۔۔۔ میں کچھ دیر میں تم سے رخصت ہو جاؤں گا۔۔۔ میری واپسی تک صرف میرے خیالوں سے اپنے دل کو سجائے رکھنا"۔۔۔ کاوش نے کہا۔۔۔ کشش اپنی پلکوں کو جھکائے خاموشی سے کاوش کی باتوں کو سنتی رہی۔۔۔

"تم کیا سوچنے لگیں کشش۔۔۔؟ کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہارے دل میں اٹھتی ہوئی آندھیوں سے غافل ہوں؟۔۔۔ نہیں کشش۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ یہ میری عارضی جدائی بھی تمہیں شاق گذرے گی۔۔۔ وطن کی خدمت کی آرزو ہر فوجی کے دل میں ہوتی ہے۔۔۔ لیکن اس کا موقع خوش نصیبوں کو ہی ملتا ہے۔۔۔ ممکن ہے کہ تم بار بار رو بھی پڑو۔۔۔ مگر کشش۔۔۔ اپنے مفاد کے لیے سب جیتے مرتے ہیں۔۔۔ وطن کی خدمت تو ہزار میں ایک کرتا ہے اور پھر ملن کی صحیح لذت فراق کی صعوبت جھیلے بغیر کوئی پا بھی تو نہیں سکتا۔۔۔"

کشش پھر بھی خاموش رہی۔۔۔

"تم کچھ بولتی کیوں نہیں۔۔۔؟ ناراض ہو کیا۔۔۔؟"

کشش نے اپنی جھکی ہوئی پلکیں اٹھائیں۔۔۔ نینوں کے کٹورے آنسوؤں سے لبریز تھے۔۔۔ وہ بڑی مشکل سے یہ کہہ سکی۔۔۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ تم سے ناراض ہو کر میں جی پاؤں گی۔۔۔؟ میری زندگی تمہاری محبت کے بغیر جسم کی قید میں رہنا شاید گوارا نہ کرے"۔۔۔ کشش نے کہا۔۔۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی کشش،۔۔۔ تمہاری اسی چاہت کا تو میں شیدا ہوں۔۔۔ تمہیں میرے لیے ہر حال میں جینا ہو گا۔۔۔ خواہ تم جس حال میں جینا پسند کرو،۔۔۔ کیونکہ میں تم سے زیادہ اب تمہاری زندگی سے پیار کرنے لگا ہوں۔۔۔ ورنہ میری انفرادیت کے آگے نہ جانے کتنی لڑکیوں نے اپنی حسین بانہیں پھیلائی تھیں۔۔۔ اور ان بانہوں کو دراز چھوڑ کر میں آگے بڑھ گیا تھا"۔۔۔ کاوش نے اپنے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔۔۔

"اب اس موقع پر تم میرے منہ سے کچھ اگلواؤ مت"۔۔۔ کشش نے محبت بھری آواز میں کہا۔۔۔

"کیا اُگلو گی ___ ؟"

"پھول کو پانے کی آرزو کون نہیں کرتا کادش ___ لیکن سب لڑکیاں پھول تو نہیں بن سکتیں !" ___ کشش اپنے ہونٹوں پر دبی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی ___

"تم وہ پھول ہو جس کی خوشبو پاکر میں مدہوش ہو جاتا ہوں" ___ کادش نے مُسکراتے ہوئے کہا ___

"بات کا رخ موڑنے کا فن تم خوب جانتے ہو" ___ کشش نے شرارتی انداز میں کہا ___ دونوں ہنس پڑے ___ پھر کادش نے کشش کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا ___

"تم سے ایک وعدہ چاہتا ہوں ___"

"کیا ___ ؟ تمھیں اپنی بیوی پر بھروسہ نہیں ___ ؟" کشش نے کہا ___

"بھروسہ نہیں ہوتا تو پھر وعدے کی اہمیت ہی کیا رہتی ___ بولو ___ وعدہ کرو گی ؟" کادش نے کہا ___

"تمھاری ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے ___ اور خدا مجھے تمہارے آگے رسوا نہ ہونے دے ___" کشش نے کہا۔

"کشش میرا حکم یہ ہے کہ اگر میں جنگ میں کام آجاؤں تو تم اپنی زندگی کو کسی نئی بہار سے سجا ضرور لینا ___ ویسے مجھے امید ہے کہ تمہاری محبت کی طاقت ہر آفات سے مجھے نکال لائے گی ___ پھر بھی جنگ، جنگ ہے، جہاں موت کب لپک کر زندگی کو دبوچ لے گی کوئی نہیں کہہ سکتا ___"

کشش اپنے ہاتھوں سے منہ ڈھانک کر دھیرے دھیرے سسکیاں لینے لگی ___

"پاگل نہ بنو ___ روشن پہلو کے ساتھ ساتھ ہر انسان کو تاریک پہلو پر بھی سوچنا چاہیے، مَیں نے بھی ایسا سوچ لیا تو کیا برا کیا ___ ؟ جنگ کے میدان میں مقابلہ کرنے والے سب زندہ تو نہیں لوٹ آتے ___ کچھ مرتے بھی ہیں ___ پر تم مسکرا دو تو مجھے یقین ہے کہ میں ضرور لوٹ آؤں گا ___" کادش نے کہا ___

کشش اپنے چہرے سے ہاتھوں کو ہٹا کر مُسکرا پڑی — یہ دوسری بات ہے کہ اس کی مسکراہٹ میں اس کے دل سے زیادہ اس کے عزم کا دخل تھا — قدرت انسان کو ٹیڑھی میڑھی راہوں پر ڈال کر نیا نیا موڑ بخش کر اس کے حوصلے کی پختگی اور عزائم کا امتحان لیتی ہے جو اپنی ہمت بٹور کر آگ کے الاؤ اور پانی کے بہاؤ کے بیچوں بیچ گذر جاتے ہیں — وہ کندن کی طرح چمک اٹھتے ہیں — اور جو حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں وہ ڈوب جاتے ہیں۔

اس کی بیوی نے اپنی صندلی بانہیں اس کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا — ہونٹ سے ہونٹ ملے، دل نے دل کی آواز سُنی — لیکن جب نگاہیں ملیں تو اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے — اس کی انگلیاں اس کی گردن پر سخت ہو گئیں — اور اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا —

"میں تمہاری واپسی کا بے چینی سے انتظار کروں گی — خدا کرے کہ وطن میں آپ کا نام روشن ہو" — کشش نے کہا۔

ٹھیک اسی وقت ٹرین دانا پور پلیٹ فارم پر رک گئی۔ اس کا ذہن ماضی سے پلٹ آیا — اپنے سامانوں کو جلدی جلدی سمیٹ کر وہ ٹرین سے اتر گیا — اپنے رجیمنٹ میں شامل ہو کر اپنے افسر کے آفس میں داخل ہو کر سلامی دیتے ہوئے کہا —

"سر — ! مَیں آگیا ہوں —"

"ویری گڈ، کل تمھیں اپنی بٹالین کے ساتھ کارگل کوچ کرنا ہے"۔ کرنل نے کہا۔

"یس سر — ، مَیں تیار ہوں"۔ میجر کادش نے کہا۔

اُس رات وہ کبھی کارگل میں ہوتی جنگ — کبھی اپنی بیوی کے مرمریں جسم — کبھی اس کے بھرے ہونٹ — اور کبھی اپنی آرزوؤں کے متعلق سوچتا رہا — کب اسکی آنکھیں بند ہوئیں — کب رات گذری، — تھکن سے وہ جان نہ پایا — اور صبح رجیمنٹ کے ساتھ روانہ ہو گیا —

جموں پہنچ کر اس کی بٹالین کو ہیلی کوپٹر سے لے جایا گیا — کارگل سے پندرہ کیلومیٹر

کی دوری پر اتار اگیا ـــــ وہاں سے بٹالین کو بکتر بند گاڑیوں سے لے جایا جا رہا تھا ـــــ بکتر بند گاڑیوں کا کارواں پہاڑوں کے دامن سے گذرنے لگا ـــــ ہر طرف آخروٹ، بید، سفیدہ، بدلو اور چنار کے درخت پھیلے ہوئے تھے ـــــ قدرت کا حسین نظارہ دیکھنے کو مل رہا تھا ـــــ شام ہونے جا رہی تھی اور چنار کا درخت ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ آگ اگل رہا ہو ـــــ اسی بیچ کہیں کہیں پر چھوٹے چھوٹے گاؤں دکھائی دے رہے تھے ـــــ لیکن بالکل خالی ـــــ نہ کوئی مرد، نہ کوئی عورت اور نہ کوئی بچے دکھائی دے رہے تھے ـــــ شاید وہ لڑائی کے خوف سے گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تھے، یا پہاڑوں کی گپھاؤں میں جا چھپے ہوں ـــــ یہاں سے چند کیلومیٹر کے فاصلے پر لڑاکو درندے ہندوستان کی زمین پر قبضہ کیے ہوئے تھے ـــــ بٹالین کو چار حصوں میں بانٹ دیا گیا ـــــ ایک حصے کی کمان میجر کاوش کے حوالے کر دی گئی ـــــ وہ کام بڑا جوکھم بھرا تھا ـــــ ہزاروں فیٹ کی بلندی پر جہاں ہر طرف برف ہی برف تھی ـــــ پہاڑ کی نوکیلی چٹان اُن چٹانوں سے گزر کر برف کی ڈھلوان پر ہندوستان کی چوکی نمبر ۲۰۱ تھی، جس پر دشمنوں کا ہی قبضہ تھا ـــــ اس نے دوربین سے اپنے محاذ کا جائزہ لیا ـــــ اور وہیں پر سے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا ـــــ دشمنوں کے توپ خانے اور مشین گنیں سب کے سب خاموش تھیں ـــــ خوف کا عالم طاری تھا ـــــ جاں بحق ہونے کا شدید احساس ہو رہا تھا ـــــ وہ اپنے جوانوں کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا ـــــ نیچے ہماری پلٹن اور توپ خانے مورچے سنبھالے ہوئے تھے ـــــ ان لوگوں سے تھوڑی دوری پر درّہ تھا اور درّہ کے پار کی پہاڑی پر دشمن تھے ـــــ وہ بڑھتے جا رہے تھے ـــــ فضا بدستور خاموش تھی ـــــ دوربین سے دشمن کی حرکت دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے ـــــ لیکن وہاں پر ایک جوان بھی دکھائی نہیں دیا ـــــ دفعتاً خاموشی ٹوٹی اور گولیوں کی آواز آنی شروع ہو گئی ـــــ اسے خطرے کا کوئی سوال نہیں تھا ـــــ وہ اتنی بلندی اور دوری پر تھا کہ دشمن کی گولیوں کی زد سے باہر تھا ـــــ وہ کمین گاہ میں بیٹھا اپنی دوربین سے

میدان جنگ کا معائنہ کرتا رہا ـــــ جوں ہی دشمن کی کمین گاہوں اور سمت، کا اندازہ ہوا ـــ ان لوگوں کی طرف سے مشین گنیں دندنانے لگیں ـــ توپیں گولے داغنے لگیں، ـــــ معلوم ہوتا تھا کہ سارے دشمن صفحۂ ہستی سے ختم ہو گئے ـــ جیسے ہی فائرنگ بند ہوئی، پھر وہی خاموشی طاری ـــ لیکن وقفے وقفے میں دونوں طرف سے گولیوں کی بیت بازی ہوتی رہی ـــ اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ قدم بہ قدم بڑھتا جارہا تھا ـــ پہاڑوں پر بارودی جالیں بچھی تھیں ـــ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے پہنچتے کئی ساتھی جاں بحق ہو گئے ـــ چند جوان بچ گئے تھے ـــ اس نے دوربین سے دیکھا کہ دشمن وار کرنے کے لیے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں ـــ میجر کاوش نے فوراً وائرلیس سے چوکی نمبر ۲۰۰ کو آگاہ کیا ـــ اپنے جوانوں کو جلد بھیجو ـــ دشمن ہماری طرف بڑھ رہے ہیں ـــ میجر کاوش ایک چٹان سے چھُپ کر گھات لگائے رہا ـــ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اِس پار یا اُس پار ـــ اور جب دشمن نزدیک پہنچ گئے تو میجر کاوش نے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ گولہ پھینکنا شروع کر دیا ـــ وہ سب جاں بحق ہو گئے ـــ میجر کاوش نے وہاں پر ہندوستان کا پرچم دوبارہ نصب کر دیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک بم پھٹا ـــ وہ شدید طور پر مجروح ہو کر بیہوش ہو گیا۔

آرمی ہسپتال میں جب وہ ہوش میں آیا اور اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ چونک گیا ـــ ڈاکٹر جو قریب ہی اس کے کھڑا تھا، اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ـــ

"چوکی نمبر ۲۰۱ پر تمہارے قبضے کے بعد دشمنوں کے بم سے تم بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ تم انتہائی خوش قسمت ہو کہ چند گھنٹے بعد ہندوستان کی دوسری بٹالین وہاں پہنچ گئی ـــ تم بیہوش تھے لیکن زندہ تھے ـــ"

"ڈاکٹر ـــ ! میرے گھر والوں کو خبر کر دی گئی ہے ـــ ؟" میجر کاوش نے پوچھا۔

"ہاں میجر، ـــ خبر دی جا چکی ہے" ـــ ڈاکٹر نے کہا۔

لیکن وہ درد کی تکلیف سے کراہ رہا تھا ـــ نرس نے ڈاکٹر کے کہنے پر انجکشن لگایا اور کچھ پل میں اسے نیند آ گئی۔

اگلی صبح وہ پوری طرح ہوش میں تھا ــــ بائیں پاؤں کے ٹخنے کے نیچے ہلکا سا درد محسوس ہوا ــــ اس نے اپنے ہاتھ سے ٹخنے کو ٹٹولا تو اس کا چہرہ احساس سے زرد ہو گیا۔ اس کے پاؤں کا دایاں حصّہ کاٹ دیا گیا تھا ــــ اپاہج ہونے کا درد پوری طرح اس کے دل و دماغ میں جاگ اٹھا ــــ اس کے احساس کا زخم جو دل میں لگا وہ بہت گہرا تھا ــــ ساری عمر وہ اس گہرائی سے نکل پائے گا یا نہیں ؟ ــــ ہماری زندگی میں جب اندھیرے ہی ہیں، تو مَیں مر ہی کیوں نہیں گیا ــــ ؟ طرح طرح کے خیالات اس کے دل و دماغ میں ابھرتے رہے ــــ اسی وقت ڈاکٹر نے آواز دی ــــ

"دیکھو ــــ میجر، ــــ کون آیا ہے ــــ ؟"

کاوش نے پلٹ کر دیکھا ــــ کشش سامنے کھڑی تھی ــــ کاوش نے اپنے درد کو سینے میں دبا کر مسکراتے ہوئے کہا ــــ

"کشش ! ــــ چوکی نمبر ۲۰۱ جو دشمنوں کے قبضہ میں تھی، مَیں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر کے ہندوستان کا پرچم لہرا دیا ــــ لیکن اس کی بہت گراں قیمت چکانی پڑی ہے مجھے ــــ میری زندگی بچانے کی خاطر میرے پیر کا کچھ حصّہ کاٹ ڈالا گیا ــــ"

کشش کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں چھلکنے لگیں ــــ اس نے اپنے اتھاہ غموں کو سینے میں چھپا کر بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ــــ

"تم ابھی کچھ مت سوچو ــــ سرجری کے ذریعہ تم عام آدمیوں کی طرح چلنے لگو گے ۔"

"ٹھیک ہے کشش ! ــــ اپاہج ہو کر میں تمھیں کس طرح کی خوشیاں دے پاؤں گا ــــ اپاہج کی زندگی کوئی زندگی ہے ؟ ــــ اس سے تو اچھا تھا مر جانا ــــ چاہت کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں ــــ خود غرضی کا نام چاہت تو نہیں ــــ اور یہ سراسر خود غرضی ہو گی ــــ"

"میں تمھارے احساس کا راز جانتی ہوں ــــ تم سمجھتے ہو کہ میرے دل میں اب تمھارا کوئی مقام نہ رہے گا جو پہلے تھا ــــ اور یہی تمہاری بھول ہے کاوش ــــ عورت کی زندگی میں جب کوئی مرد اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے تو وہ عورت پرستش

کی حد تک اسے چاہنے لگتی ہے ـــــ اور میں اس حد کو بھی پار کر چکی ہوں ـــــ اگر تمھاری جگہ میں اپاہج ہو جاتی تو کیا تم مجھے بھلا دیتے ـــــ؟ اپنا فیصلہ بدل دیتے ـــــ؟ ـــــ جواب دو کاوش ـــــ!"

"تب کیا کرتا ـــــ یہ میں نہیں جانتا ـــــ لیکن اب مجھے کیا کرنا ہے یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے ـــــ"

"اب تمہیں نہ چاہنے سے بھی تم اپنا دامن بچالو تو یہ میرے جیتے جی کبھی نہ ہوگا ـــــ" اسی وقت ڈاکٹر نے آکر کہا ـــــ

"انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے ـــــ دوسری صبح ان سے آپ مل سکتی ہیں۔" نرس نے انجکشن لگایا ـــــ تھوڑے ہی وقفے میں وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

رات کے پچھلے پہر جب اس کی آنکھیں کھلیں تو کشش کا حسین پیکر اس کے سامنے گھوم گیا ـــــ کشش کے ساتھ کئی اہم مقامات پر گھومنے کا وعدہ کیا تھا ـــــ لیکن وہ اپاہج تھا ـــــ اس خلش اور احساس نے اس کے دل کی آہنی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا تھا ـــــ یہ دکھ اسے سہا نہیں جا رہا تھا ـــــ کاوش کش مکش میں مبتلا تھا ـــــ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ کیا کرے ـــــ مانا کہ سرجری نے ترقی کی منزل چھو لی ہے ـــــ لیکن پیدائشی پاؤں کی طاقت بناوٹی پاؤں دے پائے گا ـــــ؟

کاوش نے ہمیشہ اپنے جذبات اور فرض سے وطن کو اونچا رکھا ـــــ اپنے وطن کے لیے کچھ کر پایا تھا ـــــ چوکی جو دشمنوں کے قبضہ میں تھی اس پر دوبارہ اپنے وطن کا ترنگا پرچم لہرا دیا تھا ـــــ اگر اس عظیم کارنامے کو انجام دینے میں اس کی جان بھی چلی جاتی تو وہ بھی اسکی خوش نصیبی ہوتی ـــــ یہ اس کی زندگی کا ایک عظیم کارنامہ تھا ـــــ وہ فاتح تھا ـــــ

سوچتے سوچتے اس نے اپنے سینے میں اچانک درد محسوس کیا ـــــ درد کی شدت بڑھتی ہی گئی ـــــ پھر وہ درد سے تڑپنے لگا ـــــ

نرس نے ڈاکٹر کو خبر کیا ـــــ فوراً کئی ڈاکٹر پہنچ گئے ـــــ ڈاکٹر کے مشورے پر

کاوش کو فوراً آئی۔سی۔یو (I.C.U) میں شفٹ کیا گیا ـــــ طرح طرح کی سوئیاں دی گئیں۔ آکسیجن لگایا گیا ـــــ لیکن سانس کی رفتار اور تیز ہوتی چلی گئی ـــــ اور دیکھتے دیکھتے دل کی حرکت بند ہو گئی ـــــ

ڈاکٹر جس وقت اس کے مُنہ پر سے آکسیجن کا ماسک ہٹا رہا تھا ـــ اس کی بے جان آنکھیں دروازے کی طرف مرکوز تھیں ـــــ اسی وقت کشش دوڑتی ہوئی بیڈ کے قریب آئی ـــ اور کاوش کی ساکت آنکھیں دیکھ کر دلخراش چیخ مار کر بیہوش ہو کر گر پڑی ـــــ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو ـــــ "بہت دیر کر دی آتے آتے" ـــ!

ای۔سی۔جی مونیٹر (E.C.G.Monitor) کے اسکرین پر دل کی دھڑکن کا وہ خاموش گراف اس بات کا اشارہ کر رہا تھا کہ اسے ابھی بھی کشش کا انتظار ہے ـــــ !!

□□□□

DEAD SEA

(Short Stories)

by

Shahab Dairvi

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-589-2